ڈاکٹر عرفان احمد بیگ - شخصیت و فن

تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اُردو

۲۰۱۷ء

Draft

مقالہ نگار:۔

مقبول احمد

طالبعلم شعبہ اُردو

جامعہ بلوچستان کوئٹہ

نگران مقالہ:۔

مس گل غنی

لیکچرار شعبہ اُردو

جامعہ بلوچستان کوئٹہ

جامعہ بلوچستان کوئٹہ

Draft

تصدیق نامہ

میں تصدیق کرتی ہوں کہ مقبول احمد نے ایم اے اُردو کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان: ''ڈاکٹر عرفان احمد بیگ، شخصیت و فن'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ مذکورہ مقالے میں پیش کردہ حقائق و نتائج براہ راست میری نگرانی میں اخذ کیے گئے ہیں۔ اور میں نے مقالہ نگار کی تحریر کا مطالعہ کیا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس مقالے میں بیان کیے گئے نکات تحقیقی صحت و معیار کے لحاظ سے لائق اعتنا ہیں۔

میں مزید تصدیق کرتی ہوں یہ مقالہ میری نگرانی میں تحقیقی و تنقیدی حوالے سے یونیورسٹی کے وضع کردہ تحقیقی معیار کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ میں سفارش کرتی ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحنین کو بھجوا دیا جائے۔

Draft

مس گل غنٹی

لیکچرار شعبہ اُردو

جامعہ بلوچستان کوئٹہ

سال ۲۰۱۷

انتساب

والدین، اساتذہ اور دوستوں کے نام

Draft

میقات:۔

موضوع کا انتخاب	۱۰ جولائی ۔۲۰۱۷ء
مواد کی جمع آوری	۱۰ دن
متعلقہ تحقیقی جائزے کی تیاری	۵ دن
تحقیقی کام کے خاکے کی تیاری	۵ دن
پہلا باب	۱۵ دن
دوسرا باب	۱ ماہ
تیسرا باب	۱ ماہ
اعادہ ترتیب درستگی	۱۵ دن

Draft

ڈاکٹر عرفان احمد بیگ شخصیت و فن

موضوع کا انتخاب۔

ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کی شخصیت اور فن پر اب تک جتنا کام ہوا ہے وہ سب قابل ستائش ہے۔ میں نے اپنے موضوع کا انتخاب اسی بات کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے۔ کہ بلوچستان میں اُردو ادب کی تحقیق اور خصوصاً ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کے شخصیت اور فن پر کام کے حوالے سے میرا بھی کچھ حصہ ہو۔

موضوع کی ضرورت:

ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ نہ صرف بلوچستان بلکہ پاکستان بھر میں اُردو ادب کے حوالے سے انکا بہت بڑا نام ہے۔ ان کی شخصیت اور فن پر کئی تحریریں موجود ہیں۔ مگر اُردو ادب کے طالب علموں کے لیے ایسا کوئی مبسوط تحریر موجود نہیں۔ کہ جو عرفان احمد بیگ کے فن شعر گوئی اور افسانہ گوئی کا مکمل جائزہ لے۔ اس لیے میں نے اس کی ضرورت محسوس کر کے اپنے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ تاکہ بعد کے پڑھنے والوں کے لیے ریسرچ کی صورت میں مواد موجود ہو۔ جو ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کی شخصیت اور فن کو لوگوں کے سامنے اجاگر کر سکے۔ میں اس میں کتنا کامیاب رہا یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ البتہ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ متعلقہ مواد کے ساتھ انصاف کر سکوں۔

موضوع کی اہمیت۔

ڈاکٹر عرفان احمد بیگ پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ بلوچستان میں اُردو شعر و ادب کی روایت کو آگے بڑھانے میں ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ جامعہ بلوچستان کے شعبہ اردو میں "بلوچستان میں اردو شعر و ادب کی روایت" کے پرچے کے لیے بھی ڈاکٹر صاحب کے خدمات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ موضوع خاص اہمیت کا حامل ہے۔

Draft

فہرست ابواب:

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
باب اوّل:	ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ سوانحی حالات اور شخصیت	۱
	(ا) ابتدائی حالات	۲
	(ب) ادبی و تخلیقی سفر اور تصانیف کا جائزہ	۹
	حوالہ جات/حواشی	۱۵
باب دوم:	ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کی شعری خدمات کا مطالعہ	۱۶
	(ا) "لمس کی آہٹ" تعارف و جائزہ	۱۷
	(ب) "لمس کی آہٹ" فکری جائزہ	۱۹
	(ج) "لمس کی آہٹ" فنی جائزہ	۴۱
	حوالہ جات	۵۴
باب سوئم:	ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کی افسانوی خدمات کا مطالعہ	۵۵
	(ا) "گتے کے پہلوان" تعارف و جائزہ	۵۶
	(ب) "گتے کے پہلوان" فکری جائزہ	۵۸
	(ج) "گتے کے پہلوان" فنی جائزہ	۶۶
	حوالہ جات	۸۱
	ماحصل	۸۳
	کتابیات	۸۵

Draft

پیش لفظ

الحمدللہ کہ بفضل تعالیٰ راقم کا ایم اے کا تحقیقی مقالہ تکمیل کو پہنچا۔ایم اے سال دوم میں جب تحقیقی مقالے کے لیے موضوع کے انتخاب کا مسئلہ درپیش آیا تو صدر شعبہ اُردو جناب ڈاکٹر خالد محمود خٹک صاحب کی رہبری و رہنمائی نے یہ کھٹن مرحلہ بھی آسان بنا دیا۔اور "ڈاکٹر عرفان احمد بیگ، شخصیت و فن" میرے مقالے کا موضوع قرار پایا۔ جناب راحت ملک کے ذریعے ڈاکٹر عرفان احمد بیگ صاحب سے رابطہ ممکن ہوا۔اور یوں مواد کی رسائی ہوئی اور میں مقالہ لکھنے کے اہل ہوا۔

موضوع کے انتخاب کے وقت محسوس ہوا کہ تحقیقی مقالہ لکھنا کوئی مشکل کام نہیں چند ہی دنوں میں نمٹا لینگے ۔ مگر جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ تحقیق کا کام اتنا آسان بھی نہیں ہے، جتنا میں سمجھتا تھا۔خصوصاً ڈاکٹر عرفان احمد بیگ جیسی شخصیت پر لکھنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔کیونکہ وہ یک رخ آدمی نہیں ہیں،انکے فن کے مختلف پہلو ہیں وہ بیک وقت شاعر، محقق، نثر نگار، صحافی، ڈرامہ نگار اور افسانہ نگار ہیں۔انکی وجہ شہرت ایک نہیں ہے۔ایسی شخصیت کی حیات و فن پر ایک بڑا کتابی سلسلہ ہی جواز تحقیق و تحریر بن سکتا تھا۔چونکہ ضخامت کے پیش نظر ان تمام پہلوؤں پر کام کرنا مشکل تھا اس لیے اس مقالے کو تحریر کرتے وقت انکی شخصیت کے ساتھ ساتھ انکی شعری اور افسانوی خدمات کا ہی جائزہ لیا گیا ہے۔میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ میرا یہ مقالہ حرف آخر ہوگا بلکہ یہ اُس سلسلے کی ایک کڑی ہوگی جو بعد میں عرفان احمد بیگ کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرے گی۔

میں نے اپنے اس مقالے کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

باب اوّل:۔ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ، سوانح حیات

باب دوم:۔ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کی شعری خدمات کا مطالعہ ("لمس کی آہٹ" کے تناظر میں)

باب سوم:۔ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کی افسانوی خدمات کا مطالعہ ("گتے کے پہلوان" کے تناظر میں)

باب اوّل میں عرفان احمد بیگ کی سوانح حیات، پیدائش، تعلیم، ملازمت، ازدواجی زندگی، ادبی و تخلیقی سفر، شخصیت اور

Draft

ادبی خدمات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ باب دوم میں عرفان احمد بیگ کی شعری خدمات کا "لمس کی آہٹ" کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں انکے ہاں غزل اور نظم کے بنیادی موضوعات اور فن پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب سوم میں عرفان احمد بیگ کی افسانوی خدمات کا "گنتے کے پہلوان" کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں انکے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے۔ آخر میں ماحصل کے زمرے میں اس تحقیقی مقالے کے ممکنہ نتائج اور سفارشات تحریر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شکریہ ادا کرنے کا سب سے پہلا حق بارگاہِ رب العزت کا ہے جس کے کرم سے یہ مشکل کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔ اس تحقیقی سفر میں بہت سے بزرگوں اور دوستوں نے رہنمائی کی۔ جس میں میرے مقالے کی نگران شعبہ اُردو کی لیکچرار مس گل غنی خصوصی شکریے کی مستحق ہیں۔ اظہارِ تشکر کے رسمی الفاظ بہت چھوٹے محسوس ہو رہے ہیں، مگر میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے استاد مکرم کا سپاس گزار ہوں کہ جنھوں نے نہ صرف مجھے تحقیق کی کٹھن منازل طے کرنا کا سلیقہ عطا کیا بلکہ اس مقالے کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ فرما کر نفس موضوع سے متعلق مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ اور اس مقالے کی نوک پلک درست کرنے میں بھی بڑی معاونت فرمائی۔ یقیناً اس مقالے کو مس گل غنی کی خوش نظری کے بغیر تکمیل تک پہنچانا میرے لیے ناممکن تھا۔

پروف ریڈنگ کے کٹھن اور صبر آزما کام میں ادب شناس دوستوں محمد صادق، سید اُسامہ حسین اور عبدالفتاح نے معاونت فرمائی۔ میں تہہ دل سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اور آخر میں خاص طور پر ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، کہ اس تحقیقی مقالے کے لکھنے کے دوران جب بھی مجھے ان کی مدد کی ضرورت پیش آئی انہوں نے اپنی مصروفیات پس پشت ڈال کر میری مدد اور رہنمائی کی۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں نے مقالے کے تمام پہلوؤں پر کما حقہ روشنی ڈالی ہے لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ اگر اس میں کوئی خامی نظر آئے تو اسے میری کم علمی خیال کی جائے اور اگر کوئی خوبی نظر آئے تو اسے استادِ محترم کا عطیہ تصور کیا جائے۔

احقر: مقبول احمد

Draft

باب اوّل:۔ سوانحی حالات اور شخصیت

(ا) ابتدائی حالات:۔

- تعارف۔ خاندانی پس منظر۔ ملازمت۔ ازدواجی زندگی

(ب) ادبی و تخلیقی سفر و تصانیف کا جائزہ:۔

- ادبی سفر۔ تصانیف۔ خدمات کا اعتراف

- حوالہ جات/حواشی

Draft

(ا) ابتدائی حالات:۔

ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ (تمغہ امتیاز) ۱۲ دسمبر ۱۹۵۴ء کو بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔آپکے والد کا نام "حنان احمد بیگ" ہے۔دو بہنوں اور چھ بھائیوں میں سے دوسرے نمبر پر ہے۔تخلص "عرفان" اور قلمی نام "ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ" ہے۔ذات "مغل"، اور اُردو انکی مادری زبان ہے۔اسی لیے اہل زبان کہلاتے ہیں۔ مادری زبان کے علاوہ انگریزی، براہوئی، پشتو اور پنجابی زبانوں پر مہارت حاصل ہے۔انگریزی زبان میں انہیں خصوصی مہارت حاصل ہے۔انگریزی زبان پڑھنا، بولنا اور خاص کر انگریزی زبان سے ترجمہ کرنا ان کو خوب آتا ہے۔پنجابی روانی سے بولتے ہیں۔جبکہ براہوئی اور پشتو سمجھتے ہیں اور کچھ بول بھی لیتے ہیں۔ملازمتوں کے سلسلے میں کوئٹہ سے باہر بھی رہنا پڑا۔مگر آج کل کوئٹہ میں اسٹیورٹ روڈ پر "مکان نمبر ۹-۳/۱۴" میں رہائش پذیر ہیں۔

ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کے خاندان میں شروع ہی سے تعلیمی پس منظر بہت بہتر رہا ہے۔تقریباً سات پشتوں سے انکے آباؤ اجداد پڑھے لکھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔انکے آباؤ اجداد مغلیہ عہد سے لے کر انگریزوں کے زمانے تک اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

تقسیم ہند اور آزادیِ پاکستان کے وقت عرفانؔ احمد بیگ کے والد حنان احمد بیگ سی پی (Centeral Provience) موجودہ مدھیا پردیش سے ممبئی اور ممبئی سے بذریعہ بحری جہاز کراچی آئے، جو اس وقت پاکستان کا دارالحکومت تھا۔یہاں سے انکی پوسٹنگ ریلوے میں کالا باغ (صوبہ پنجاب) میں ہوئی۔جہاں سے کچھ عرصے بعد انکا تبادلہ راولپنڈی کر دیا گیا۔بعد میں راولپنڈی سے انکا تبادلہ کوئٹہ میں ہوا۔حنان احمد بیگ گریجویٹ اور ریلوے میں ڈائریکٹ سینئر پسینجر ٹرین کارڈ تھے اور اس وقت (آزادی کے وقت) بمعہ الاؤنس انکی تنخواہ ۳۰۰ روپے ماہانہ تھی۔

عرفانؔ احمد بیگ کے جد امجد خان غازی الخان بیگ "سینٹرل ایشیاء" سے ہندوستان آئے اور دہلی میں آباد ہو گئے۔ہندوستان آنے کے بعد خان غازی الخان بیگ نے بھارت کے صوبے رائے پور کے شہر میں

Draft

محلہ بجنات پارہ میں حویلی حاصل کی تھی۔اور اسی طرح اسی شہر کے نواحی علاقوں میں انکے پاس قدرے چھوٹی جاگیر تھی جو چند ہزار ایکڑ زرعی رقبے کے ساتھ دو گاؤں پر مشتمل تھی۔جس میں سے ایک کا نام "عرفان نگر" تھا۔اور غالباً یہی وجہ تھی کہ عرفانؔ احمد بیگ کی پیدائش پر انکے والد حنان احمد بیگ نے انکا نام اسی گاؤں کی نسبت سے عرفانؔ رکھا۔

مرزا خان غازی الخان بیگ کے بیٹے مرزا جان بیگ کے دور میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہوئی۔چونکہ انکا تعلق شاہی خاندان سے بہت نزدیکی تھا' اس وجہ سے وہ اور انکے دیگر بھائی زیر عتاب آئے۔اور مرزا جان بیگ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ دہلی سے جان بچا کر فرار ہو گئے۔اور کئی روز کی مسافت کے بعد سی پی (Central Provience) موجودہ مدھیا پردیش میں اپنی جاگیر اور اپنی رائے پور کی حویلی پہنچے۔

مرزا جان بیگ کے بیٹے فطرت بیگ اور فطرت بیگ کے بیٹے مرزا اسماعیل بیگ (ڈاکٹر عرفانؔ بیگ کے دادا) تھے۔مرزا اسماعیل بیگ انگریزوں کے دور میں "رائے پور سی پی (Central Provience)" بھارت میں محکمہ انہار میں سینئر کلرک تھے۔مرزا اسماعیل بیگ خود شاعر بھی تھے اور محوؔ تخلص استعمال کرتے تھے۔مرزا اسماعیل کے بھائی (ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کے دادا چچا) انگریزوں کے دور میں ڈی ایس پی تھے۔انکے دو بیٹے ہیں۔جن میں سے ڈاکٹر امجد علی بیگ (مرحوم) جامشورو یونیورسٹی میں ڈین اور اکنامکس کے صدر شعبہ رہے۔جبکہ انکے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ارشد علی بیگ "پی ایس آئی آر، P,S,I,R" لیبارٹریز کے چیئرمین اور سیکرٹری کے عہدوں پر فائز رہے۔اور اب ریٹائر حیثیت میں بطور ریسرچ سائنسدان پاکستان میں ماحولیات کے شعبے میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مرزا اسماعیل بیگ کے پانچ بیٹے تھے۔جن میں سے مرزا حنان احمد بیگ (ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کے والد) سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔عرفانؔ احمد بیگ کے ان تایا میں سجاد احمد بیگ موسیقی اور فن شاعری پر دسترس رکھتے تھے اور حامد عزیز مدنی (معروف نظم گو شاعر) کے بہت ہی گہرے دوست تھے۔

حنان احمد بیگ کے چھ بیٹے ہیں۔جن میں سے سلمان احمد بیگ بڑے بیٹے' یعنی ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کے بڑے بھائی ہیں' اور "آئی سی ایم اے I.C.M.A" کی ڈگری کے حامل ہیں۔اکاؤنٹس کے شعبے میں انکا بڑا نام ہے۔وہ پی پی ایل اور بولان مائننگ کمپنی میں ڈائریکٹر فنانس کے عہدوں پر کام کرتے رہے۔اور آج کل ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی میں فراغت کی زندگی

Draft

گزار رہے ہیں ۔عرفانؔ احمد بیگ سے چھوٹے بھائی عثمان احمد بیگ ہیں۔جو سمال انڈسٹری سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر فراغت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اِنکو بھی شعر و شاعری سے کافی شغف ہے۔ اِن سے چھوٹے بھائی ریحان احمد بیگ نے سوشل ورک میں ماسٹر کیا اور آج کل صوبائی محکمہ لیبر مین پاور میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر کوئٹہ میں فائز ہیں ۔ان سے چھوٹے بھائی پروفیسر رحمان احمد بیگ ہیں۔جنھوں نے ایم اے انگلش لٹریچر میں کیا اور فضائیہ کالج کوئٹہ میں پرنسپل کے عہدے سے حال ہی میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر معروف پرائیوٹ تعلیمی ادارے ویلڈرنیس کوئٹہ میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ان سے چھوٹے بھائی سلطان احمد بیگ نے باٹنی میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی ہے اور اِس وقت گورنمنٹ کالج سریاب روڈ کوئٹہ میں باٹنی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔

ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کی والدہ روحہ النساء بھی میٹرک تک تعلیم یافتہ تھیں اور نہ صرف اُردو، انگریزی بول، لکھ اور سمجھ سکتی تھیں بلکہ شعر فہمی کا بھی ذوق رکھتی تھیں۔ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کے نانا پروفیسر شرف الحق فاروقی (ایم اے، ایل ٹی L.T) نہ صرف سی پی (Centeral Provience) بھارت کے معروف ماہر تعلیم تھے بلکہ انگریزوں نے انھیں ریٹائرمنٹ کے بعد آنریری مجسٹریٹ بھی بنا دیا تھا۔

عرفانؔ احمد بیگ کی دو بہنیں ہیں۔ایک بہن جو انکے بعد پیدا ہوئیں، انکا نام افسر النساء ہے، جنھوں نے فرسٹ ڈویژن میں نمایاں حیثیت سے جامعہ بلوچستان سے ایم ایس سی کیمسٹری کی اور شادی شدہ ہیں۔اور ابھی انکے دو بچے بی ایس ایس کر چکے ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔جبکہ بڑی بیٹی ڈاکٹر ہیں اور وفاقی سرکاری ہسپتال میں سینئر ڈاکٹر کے طور پر کام کر رہی ہیں۔اور دوسری بہن محترمہ طاہرہ جو عثمان احمد بیگ کے بعد پیدا ہوئیں۔انہوں نے ایم ایس سی لائبریری سائنس کیا ہے۔ کچھ عرصہ ملازمت کی اور اب فارغ ہیں۔

تعریف کی بات یہ ہے کہ عرفانؔ احمد بیگ اور انکی بہن محترمہ طاہرہ اور تمام بھائی اور اِن تمام بھائیوں کے بیوی بچے کوئٹہ شہر کے قلب میں واقع اسٹیورٹ روڈ کے ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔باورچی خانہ بھی ایک ہے۔ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ یہ پورا کنبہ جو خواتین اور بچوں سمیت ۲۵ افراد پر مشتمل ہے ایک ہی دسترخوان پر ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔اور اب تو ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کے صاحبزادے فطرت فیضان بیگ بھی شادی شدہ ہو چکے ہیں۔جبکہ عثمان احمد بیگ کی دو بیٹیاں بیاہ کر اپنے گھر جا چکی ہے۔

Draft

غرض یہ کہ ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کا خاندانی پس منظر شجرہ کے اعتبار سے سات پشتوں تک تعلیم یافتہ اور شعر و ادب سے منسلک نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ نے اپنی ابتدائی تعلیم کلی شیخان ہائی سکول (ا۔) ارباب کرم خان روڈ سے حاصل کی۔ اور مڈل تک یہیں سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر سنڈیمن ہائی سکول میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ والد حسّان احمد بیگ کی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے انھیں اپنی ریگولر تعلیمی سلسلے کو خیرباد کہنا پڑا اور محنت مزدوری کرنے لگے۔ پھر ۱۹۷۴ء میں میٹرک کا امتحان پرائیوٹ امیدوار کے طور پر سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۷۴ء میں چونکہ بلوچستان کو نیا نیا صوبے کا درجہ ملا تھا اس لیے صوبے کے مختلف محکموں میں سرکاری ملازمتوں کی اشد ضرورت تھی۔ تو ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ بھی فوری طور پر پرائمری ٹیچر بن گئے۔ اور آپ کی پہلی پوسٹنگ افغان سرحد کے قریب دولنگی تھانہ کے پاس ایک گاؤں (کلی حکیم پرائمری سکول) میں ہوئی۔ اور وہاں ایک سال تک یعنی ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۵ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر وہاں سے کلی اسماعیل پرائمری سکول کوئٹہ میں آپ کا تبادلہ ہوا اور یہیں پڑھانے پر مامور ہوتے۔ ۱۹۷۸ء میں پی ٹی سی ٹیچر ٹریننگ کورس کلی شیخان ہائی سکول سے حاصل کی۔ ۱۹۸۱ء میں ایف اے کا امتحان بھی بطور پرائیوٹ امیدوار کے پاس کیا۔ ۱۹۸۲ء میں جے ای ٹی ٹیگ کا ایک سالہ کورس بلوچستان ایگروٹیگ کالج کوئٹہ سے حاصل کرنے کے بعد ۱۹۸۳ء میں سنڈیمن ہائی سکول میں ایگروٹیگ ٹیچر بن گئے۔ ۱۹۸۴ء میں پرائیوٹ امیدوار کے طور پر بی اے کا امتحان پاس کیا اور محکمانہ چھٹی (اسٹڈی لیو) لے کر جامعہ بلوچستان یونیورسٹی سے سوشل ورک میں بطور ریگولر طالبعلم اپنا پہلا ایم اے ۱۹۸۶ء میں پاس کیا۔ اسی دوران ڈاکٹر عرفان احمد بیگ (یعنی ۱۹۷۵ء سے) بطور نوجوان رائٹر و شاعر ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکے تھے۔ باقاعدہ افسانہ نویسی اور شاعری تو ۱۹۷۰ء ہی سے شروع کی تھی۔ لیکن ۱۹۷۵ء سے ریڈیو پاکستان، روزنامہ مشرق اور پاکستان ٹیلی وژن کے پروگراموں میں بھی بطور رائٹر شاعر شرکت کرنے لگے اور معاوضہ لے کر کام کرتے رہے۔

۱۹۸۷ء میں بی ایڈ اور ۱۹۸۸ء میں ایم ایڈ کر لیا۔ ۱۹۸۹ء میں ایم اے اُردو اور ۱۹۹۰ء میں ایم اے ہسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کی وساطت سے سپیشل ایجوکیشن میں بطور سینئر ٹیچر، انچارج آفیسر، گزیٹڈ آفیسر گریڈ ۱۷ میں تعینات ہوئے۔ اور بطور قائم مقام ڈائریکٹر اسپیشل ایجوکیشن سینٹر خضدار تعینات ہوئے۔ اِسی دوران پروفیسر ڈاکٹر

فردوس انور قاضی (۲۔) کی نگرانی میں پروفیسر مجتبیٰ حسین (۳۔) کی فن اور شخصیت پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کیا۔ ۱۹۹۰ء میں بلوچستان پبلک سروس کمیشن کے تحریری امتحان اور انٹرویو میں کامیابی کے بعد بطور لیکچرر اُردو محکمہ تعلیم بلوچستان شعبہ کالجز میں اُردو لیکچرار تعینات ہوئے۔ اور بطور اُردو لیکچرار آپکی پہلی پوسٹنگ گورنمنٹ کالج گوادر میں ہوئی۔ جہاں آپ ۱۹۹۵ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر بلوچستان پبلک سروس کمیشن میں اسسٹنٹ پروفیسر اُردو کا تحریری امتحان اور انٹرویو پاس کیا اور اسسٹنٹ پروفیسر تعینات ہوگئے۔ اس دوران آپکی پوسٹنگ سائنس ڈگری کالج کوئٹہ اور گورنمنٹ ڈگری کالج بیلہ میں ہوئی۔ اس دوران عطا شاد (۴۔) کے فن اور شخصیت پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔

دسمبر ۱۹۹۹ء کو سرکاری ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ ۲۵ سالہ دور ملازمت پر لی۔ اور اس کے فوراً بعد تعمیر نو کالج میں بطور لیکچرار ملازمت اختیار کر لی۔ جہاں چند برس بعد اسسٹنٹ پروفیسر اور پھر ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر تعینات ہوئے اور ابھی اسی حیثیت سے تعینات ہیں اور پڑھا رہے ہیں۔ اپنی ملازمت کے دوران ڈاکٹر عرفان بیگ بطور ویزٹنگ پروفیسر بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ اُردو اور بلوچستان یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی انجینئرنگ اینڈ مینجمنٹ سائنس (بیوٹمز) کے شعبہ ابلاغیات میں بھی پڑھاتے رہے ہیں۔

سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے صحافت کے شعبے میں بھی کام کیا۔ اور مختلف قومی اور مقامی اخبارات و جرائد سے بھی وابستہ ہوئے (آج کل روزنامہ جنگ سے وابستہ ہے)۔ چونکہ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ ۱۹۷۵ء ہی سے بطور نوجوان شاعر و ادیب، ریڈیو صداکار، ڈرامہ رائٹر معروف ہو چکے تھے۔ اسی لیے ۱۹۷۵ء سے روزنامہ مشرق میں باقاعدہ سیکنڈ ٹائم ملازمت اختیار کر لی۔ اس دوران روزنامہ مشرق کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن کو (مدیر مقبول رانا کے ساتھ) مرتب کرتے رہے۔ اس کے علاوہ روزنامہ مشرق میں ادبی، ثقافتی اور تعلیمی موضوعات پر کالم، مضامین اور فیچر وغیرہ بھی لکھنے شروع کیے۔ اِس دوران ریڈیو پر بھی اِسی نوعیت کے پروگراموں کا سلسلہ جاری رہا اور یہ سارا کام معاوضے کی بنیاد پر ہوتا رہا۔ اس لیے ۱۹۷۷ء میں بلوچستان کی ایک معروف ثقافتی ادبی تنظیم (قومی ایوان ثقافت) کی جانب سے نوجوان شاعر کے طور پر ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کو گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔ یہ گولڈ میڈل اس وقت کے معروف اداکارہ صبیحہ خانم نے دیا۔

Draft

۱۹۷۴ء کو پاکستان ٹیلی وژن کوئٹہ سینٹر قائم ہوا تو اس میں بھی ۱۹۷۷ء سے حصّہ لینا شروع کیا۔ اس دوران آپکے گیت غزلیں نہ صرف ٹیلی وژن سے گلوکاروں نے گائیں۔ بلکہ عملی طور پر آپ نے نوجوانوں سے متعلق ٹی وی پروگراموں میں بھی حصّہ لینا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی قومی سطح کے ادبی رسائل وجرائد اور مختلف اخبارات (روزنامہ دن وغیرہ) میں لکھنا شروع کیا۔

۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۴ء روزنامہ جنگ میں سیکنڈ ٹائم ملازمت اختیار کی۔ اور سماجی، ثقافتی اور تعلیمی موضوعات پر ریسرچ آرٹیکل لکھنا شروع کیا۔ اب تک ریسرچ کی بنیاد پر ۷۰۰ سے زائد فل پیج آرٹیکلز صرف جنگ کوئٹہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ جبکہ روزنامہ مشرق میں بھی کئی فل پیج آرٹیکلز شائع ہو چکے ہیں۔ اس زمانے میں چونکہ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کی پوسٹنگ خضدار میں ہوئی تھی اس لیے صحافت سے چند سال دور رہے۔ البتہ مختلف قومی ادبی رسالوں میں لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر دوبارہ روزنامہ جنگ اور روزنامہ مشرق میں بطور سب ایڈیٹر، انچارج ادبی صفحہ اور فیچر رائٹر، سیکنڈ کام کرتے رہے۔ اور ۲۰۰۱ء سے تاحال بطور فیچر رائٹر اور کالم نگار روزنامہ جنگ سے وابستہ ہیں۔ اور ہر ہفتے انکے فل پیج آرٹیکلز روزنامہ جنگ میں شائع ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے تنقید کے حوالے سے بھی خدمات سرانجام دی۔ انکے تنقیدی مضامین قلم قبیلہ اور ملک کے دوسرے مؤقر رسالوں اور جریدوں میں چھپتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر عرفان احمد بیگ قریباً ۳۷ سال کی عمر میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوگئے۔ تاخیر سے شادی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے والد صاحب کی بیماری سے لے کر جولائی ۱۹۸۵ء انکی وفات تک قریباً سولہ سال پر محیط اس عرصے میں انھیں کافی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور خصوصاً انھیں اپنی ریگولر تعلیمی سلسلے کو ادھورا چھوڑنا پڑا۔ اور پھر تعلیم کے ساتھ ساتھ روزگار کے مسائل اور دیگر گھریلو اخراجات کی وجہ سے وہ بروقت شادی نہ کر سکے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ شروع ہی سے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر ۱۹۸۵/۸۶ء میں اپنے پہلے ایم اے کے دوران اسے شدت کا عشق ہوا۔ اور اپنی ایک ہم جماعت کو پسند کرنے لگے اور انہی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ محترمہ بھی انھیں چاہتی تھی۔ مگر کچھ سماجی مشکلات کی وجہ سے انکی شادی ممکن نہ ہو سکی۔ بعد میں جب اُن محترمہ کی شادی کسی اور جگہ ہوئی تو عرفان احمد بیگ کی والدہ محترمہ بضد ہوگئیں کہ اب تو شادی نہ کرنے کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے اب شادی کرنی چاہیے۔ تو یوں ۱۹۹۲ء میں کافی تاخیر سے انکی شادی ہوگئی۔ اور خدا نے یکے بعد دیگرے انھیں دو بیٹوں سے نوازا۔

Draft

اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کہتے ہیں کہ:

"یہ شادی میری زندگی میں بہت مددگار ثابت ہوئی۔ خاص کر میری شریک حیات میرے ساتھ زندگی کے ہر معاملے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ میری زوجہ نے شروع میں بی اے کیا تھا۔ بعد میں اس نے بھی ایم اے اُردو کرلیا۔ یکے بعد دیگرے خدا نے دو بیٹوں سے نوازا۔ جن میں سے فطرت فیضان بیگ ابھی شادی شدہ ہیں۔ اور ایک این جی او میں انجینئر ہے۔ جبکہ چھوٹا بیٹا مرزا افنان بیگ کیمیکل کے شعبے میں انجینئرنگ کر رہا ہے۔ اور وہ ۲۰۱۸ء کے وسط تک فارغ ہوگا۔ مجموعی طور طرز زندگی خوش وخرم گزر رہی ہے۔"(۵)

کھلتی رنگت کا سانولا ڈاکٹر عرفان بیگ بچپن سے جوانی تک عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور اور مضبوط قسم کا آدمی رہا۔ محنت ومشقت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں بھی دیں۔ آواز تحت اللفظ پڑھنے کے لیے بہت موزوں تھی۔ اسی لیے سکول کے زمانے سے ہی بہترین مقرر ثابت ہوئے، اور یہی وجہ تھی کہ بطور صدا کار ریڈیو بھی بہت مقبول ہوئے۔ کھیلوں میں ہاکی سب سے زیادہ پسند ہے۔ سکول کے زمانے ہی سے ہاکی بہت شوق سے کھیلا کرتے تھے، مگر حالات کی وجہ سے ہاکی کے کھیل کو جاری نہ رکھ سکے۔ البتہ انکے کچھ قریبی دوست قومی اور بین الاقوامی سطح پر اور کچھ دوست اولمپک میں بھی حصہ لے چکے ہیں۔ باکسنگ کا شوق بھی کافی عرصے تک رہا۔ موسیقی سے بے حد لگاؤ ہے۔ موسیقی میں پیانو، موتھ آرگن، اور بانسری نہ صرف سیکھی بلکہ بجاتے بھی ہیں۔ اور بانسری تو آج تک بڑے شوق سے بجاتے رہتے ہیں۔ عرفان احمد بیگ کو دوست بنانے کا فن خوب آتا ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین، عطا شاد، ماہر افغانی، ظفر خان نیازی، خادم مرزا، ڈاکٹر فاروق احمد، دانیال طریر، آغا محمد ناصر سے لے کر راحت ملک، افضل مراد، وحید زہیر، بیرم غوری، عارف ضیا، علی بابا تاج، فاروق سرور، محسن شکیل تک یہ دوستی کا سفر آج بھی جاری وساری ہے۔ جس میں ہر عمر اور مرتبے کے لوگ شامل ہیں۔ اچھے کھانے پکانا اور دوستوں کو کھانے کھلانا، لطیفہ بازی اور خوش گپیاں انکے خاص مشغلوں میں شامل ہیں۔ بنیادی طور پر وہ منافقت سے دور ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔ بلکہ انکی آرزو بھی ہے کہ پوری دنیا میں ایک ایسا نظام محبت قائم ہو جس میں کسی کا فائدہ کسی کا نقصان نہ بنے۔

Draft

(۷) ادبی و تخلیقی سفر اور تصانیف کا جائزہ

ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے شاعری اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اپنائی۔ وہ بچپن ہی سے کافی شوخ واقع ہوئے تھے۔ اشعار گنگنانا اور سکول کے زمانے میں اشعار کی فی البدیہہ پیروڈی کرنا اُنکا اہم مشغلہ تھا۔ بچپن سے انھیں گھر ہی سے سخن فہم ماحول ملا تھا۔ والد اور والدہ دونوں شعر گوئی کا فہم رکھتے تھے۔ گھر کا ماحول اتنا سخن فہم تھا کہ گفتگو میں اشعار کا حوالہ دینا ایک عام سی بات تھی۔ اور یہ عرفان احمد بیگ کے لیے شعر کہنے کی ایک طرح کی تربیت تھی۔ اسکے علاوہ ان کے دادا اسماعیل بیگ بھی شاعر تھے اور محو تخلص استعمال کرتے تھے۔ اس لیے انکے والد اور گھر کے دوسرے افراد کے ہاں شروع ہی سے ایک شعر گوئی کا سلسلہ چل نکل آیا تھا۔ غالبؔ، میرؔ، دردؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور فیضؔ کے اشعار بچپن سے گھر میں سنے اور خصوصاً انکے گھر میں اقبال کو زیادہ پڑھا اور پسند کیا جاتا تھا۔

عرفان احمد بیگ کے والد حنان احمد بیگ کو بسلسلہ ملازمت ایک بڑا بنگلہ ملا تھا۔ جس میں کافی کمرے تھے۔ اور ان میں سے ایک کمرہ عرفان احمد بیگ اور انکے بڑے بھائی سلمان احمد بیگ کا مشترکہ تھا۔ جس میں کافی عرصے تک وہ ایک ساتھ رہے۔ چونکہ آپکے بڑے بھائی صاحب سلمان احمد بیگ کو شاعری پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں چونکہ سلمان احمد بیگ نوجوان تھے اور عرفان احمد بیگ لڑکپن میں۔ اس لیے آپکے بڑے بھائی صاحب فیض احمد فیضؔ، اختر شیرانی، قتیل شفائی، منیر نیازی، احمد فرازؔ اور اسطرح کے کئی دوسرے شعراء کو پڑھا کرتے اور ان کے اشعار عرفان احمد بیگ کو سنایا کرتے تھے۔ آپکے والد حنان بیگ کے ایک شاعر دوست مغموم نقوی بھی اکثر انکے گھر آجاتے۔ بیٹھک میں چائے کے دور کے ساتھ ساتھ شاعری کا بھی دور چلتا۔ اور حنان بیگ ان سے شعر سنانے کی فرمائش کرتے اور وہ ترنم کے ساتھ شعر پڑھتے رہتے۔ آج بھی انکو مغموم نقوی کے کئی اشعار یاد ہیں۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

Draft

؎ ”ہر مصیبت میں تجھے میں نے پکارا اے دوست
تیرا بخشا ہوا ہر درد گوارا اے دوست

؎ جھک کر چلو حیات بڑی مختصر سی ہے
کہتا ہوں ایک بات بڑی مختصر سی ہے۔“ (۶)

یوں اسطرح سے عرفان احمد بیگ کو گھر ہی سے شعر سمجھنے اور کہنے کا فن آچکا تھا۔

گھر کے بعد عرفان احمد بیگ کی ادبی آبیاری میں سکول کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سکول کے زمانے میں وہ کافی شرارتی تھے۔ ہنسنا ہنسانا انکی عادت تھی۔ نویں جماعت کے اُردو کے پیریڈ میں وہ نظموں اور غزلوں کی فی البدیہہ پیروڈی کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں چونکہ وہ سنڈیمن ہائی سکول میں پڑھتے تھے اور جماعت کی تعداد کافی زیادہ ہونے کی وجہ سے جب وہ اشعار کی پیروڈی کیا کرتے تو انکے پاس بیٹھے دوست ہنستے رہتے۔ اور اسطرح پڑھانے کا عمل متاثر ہوجاتا۔ ماضی کو بازیافت کرتے ہوئے عرفان احمد بیگ کہتے ہیں کہ:

”ارشد صاحب ہمارے اُردو کے استاد ہوا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں مار بھی بہت زیادہ پڑتی۔ جب میں پیروڈی سناتا تو اس سے پڑھانے کا عمل متاثر ہوتا تو استاد محترم نے مجھے پکڑنے کی کافی کوشش کی مگر میں بچ نکلتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ارشد صاحب نے کچھ دوستوں کو پکڑ لیا۔ ذرا سی مار پڑی تو دوستوں نے میرا نام لیا کہ عرفان ان اشعار کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے تو ہمیں ہنسی آجاتی ہے۔ اس وقت پتہ نہیں تھا کہ میں جن اشعار کو الٹ پلٹ کر دیتا ہوں وہ پیروڈی ہوتی ہے۔ کیا پتہ تھا کہ پیروڈی کیا چیز ہے؟۔ ارشد صاحب نے بلایا اور کہا پڑھو جب میں نے پیروڈی سنایا تو وہ بھی ہنسنے لگے اور ارشد صاحب وہ پہلی شخصیت تھے جنھوں نے کہا کہ: ”تمھارے اندر ایک فطری شاعر چھپا ہوا ہے اور تم پیدائشی شاعر ہو“ (۷)۔

Draft

جب ریلوے کالونی میں یونین تحریکوں کا دور تھا۔ اشتراکی نظریات اور بائیں بازو کے لوگوں کے ساتھ ساتھ دائیں بازو کے نظریات کے حامل لوگ بھی موجود تھے۔ لیکن عرفان احمد بیگ ترقی پسند نظریات سے متاثر ہوئے اور ترقی پسند شاعری کی طرف انکا رجحان گیا۔ اگرچہ انکے گھر میں زیادہ تر اقبال ہی کو پڑھا جاتا۔ اس زمانے میں عرفان احمد بیگ اور غلام حیدر مرحوم (۸۔) کے درمیان کافی گہری دوستی تھی اور یہ دونوں دوست ترقی پسند ادب کا بہت زیادہ مطالعہ کرنے لگے۔ ۷۰/۱۹۶۹ء سے لے کر ۱۹۷۹ء تک ان کا مطالعہ زیادہ تر انہی خطوط پر یعنی انقلاباتِ دنیا اور تاریخ و ادب پر مشتمل رہا۔ پھر عرفان احمد بیگ فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی کی شاعری کا بہت ہی زیادہ مطالعہ کرنے لگے۔ سوانح عمری پڑھنے کا بھی شوق رہا۔ مصطفی کمال پاشا، مراکش کا بن بلا، بھوم دین، انڈونیشیاء کے سکارنو، کرنل قذافی، ذوالفقار علی بھٹو، ماوزے تنگ، چوئن لاں، کیوبا کے فیڈل کاسترو اور چی گویرا جیسے اشخاص جن میں سے زیادہ تر اُس وقت زندہ تھے۔ ان کی معلومات اور تاریخ کے مطالعے نے عرفان احمد بیگ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اکنامکس میں کارل مارکس کے فلسفے کو بھی پڑھا تو وہیں ڈاکٹر آدم سمتھ سے بھی فیض اٹھایا۔ سوشیالوجی اور نفسیات کا بہت زیادہ گہرا مطالعہ کیا۔ خصوصاً نفسیات میں ڈاکٹر ژونگ، سگمنڈ فرائیڈ اور دیگر نفسیات دانوں کو پڑھا۔ اس کے بعد یورپ کے انقلابات، انقلاب فرانس وغیرہ اور بعد میں روسو اور والٹیئر کو ۱۹۷۵ء تک پڑھا۔ البتہ اس دوران وہ شاعری بھی کرتے رہے مگر شعر صرف اپنے قریبی دوست محترم غلام حیدر مرحوم کو ہی سنایا کرتے تھے۔

۱۹۷۵ء کے دوران عرفان احمد بیگ اور انکے دوست غلام حیدر (مرحوم) کی شناسائی اُن سے دو چار سال بڑے ایک نامور شاعر اعتبار ساجد سے ہوئی۔ اور جب اعتبار ساجد نے عرفان احمد بیگ سے شعر سنے تو ان کو کوئٹہ کے ادبی حلقوں میں متعارف کرانا شروع کیا۔ یوں عرفان احمد بیگ کی رسائی ادبی حلقوں تک ہوئی۔ مقبول احمد رانا (مدیر روزنامہ مشرق)، ریاض قمر اور پاکستان آرٹس کونسل کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر عطاء شاد سے بھی اعتبار ساجد نے ہی انھیں واقفیت دلائی۔ ریڈیو اسٹیشن میں ظفر خان نیازی سے بھی انہوں نے ہی واقف کرایا۔ اثر جلیلی، ماہر افغانی، رفیق راز، افسر بہزاد اور اپنے ہمعصر شعراء بیرم سخوری اور نجم الثاقب سے بطور شاعر نہ صرف متعارف ہوئے۔ بلکہ بہت جلد ادبی حلقوں میں تسلیم بھی کیے گئے۔ عرفان احمد بیگ نے ۱۹۷۵ء میں پاکستان آرٹس کونسل کے زیر اہتمام آل پاکستان مشاعرے میں شرکت کی یہ انکا پہلا مشاعرہ تھا۔ بعد میں ایک اور مشاعرے میں جس میں منیر نیازی، احمد فراز، پروین شاکر اور

Draft

افتخار عارف جیسے قد آور شخصیات نے شرکت کی وہاں بھی شعر پڑھے۔ اسکے بعد احمد فراز، قتیل شفائی، منیر نیازی اور اِن جیسے دوسرے قد آور شخصیات سے انکی واقفیت ہوئی۔ اور یوں مختلف ادبی مجالس اور مشاعروں میں شرکت کرنے کا سلسلہ چل نکلا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

عرفان احمد بیگ نے ڈرامے بھی لکھے۔ ۱۹۸۴/۸۵ء کو ملک کے مشہور پروڈیوسر کاظم پاشا نے آپکے ڈرامے بھرم، ساحل وغیرہ کو پروڈیوس کیا۔ اسٹیج کے لیے بھی ڈرامے لکھے اور بطور اداکار اسٹیج پر شروع شروع میں آئے۔ پھر خیال آیا کہ شوبز کی دنیا میں آدمی کا وقت ضائع ہوتا ہے اور آدمی بہتر طریقے سے مطالعہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے شوبز کو بطور اداکار جلد ہی خیر باد کہا البتہ شوبز کے لیے لکھتے ضرور رہے۔

اب تک ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کے ۱۳ کتابیں منظر عام پہ آچکی ہیں۔ جنکی تفصیل درج ذیل ہیں:۔

۱۔ ”رنگ ادب (تذکرہ شعراء بلوچستان)“۔۔۔ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کی پہلی کتاب ہے جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہو کر منظر عام پہ آئی۔ ۱۹۷۸ء سے ڈاکٹر عرفان احمد بیگ روزنامہ مشرق کے ادبی صفحے کے لیے بلوچستان کے مشہور شعراء کا انٹرویو لیا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں حالی سیدی روزنامہ مشرق میں آرٹ ایڈیٹر تھے اور حالی سیدی اور لال حسین ناصر جو قومی ایوانِ ثقافت کے ڈائریکٹر تھے انہیں کے مشورے پر ان انٹرویوز کو ایک کتابی شکل دے کر شائع کروایا۔

۲۔ ”گتے کے پہلوان“۔۔۔۔یہ کتاب الحمد پبلی کیشنز لاہور کی جانب سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب عرفان احمد بیگ کے نمائندہ افسانوں پر مشتمل ہیں۔

۳۔ ”قلم قبیلہ (ایک ادارہ ایک تحریک)“۔۔۔قلم قبیلہ کے ۲۵ سال مکمل ہونے پر ثاقبہ رحیم الدین اور ڈاکٹر فردوس انور قاضی کی درخواست پر یہ کتاب لکھی گئی اور ۲۰۰۱ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔

۴۔ ”سانحہ نیویارک سے سقوط کابل تک“۔۔۔یہ ایک سیاسی نوعیت کی کتاب ہے جو نیویارک میں ۹/۱۱ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے سے لے کر کابل پر امریکی چڑھائی کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔

۵۔ ”حیاتِ جاوداں (صوفی محمد یعقوب شہید)“۔۔۔یہ کتاب آزاد کشمیر میرپور سے تعلق رکھنے والے صوفی محمد یعقوب شہید کی سوانح عمری ہے اور ادبی طرز و پس منظر کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

۶۔ ”پاکستان میں قدرتی آفات (تدارک و آبادکاری)“۔۔۔یہ کتاب ۲۰۰۷ء میں چھپی۔ ۸

Draft

اکتوبر ۲۰۰۵ء کے ہولناک زلزلہ (جب آزاد کشمیر، خیبر پختونخوا اور ملحقہ علاقوں میں ایک لاکھ سے زائد افراد لقمہ اجل بن گئے اور ۴۰ لاکھ سے زائد افراد بے گھر ہو گئے) کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔

۷۔ ''لمس کی آہٹ''۔۔۔۔ یہ کتاب عرفان احمد بیگ کا شعری مجموعہ ہے۔ جسے الحمد پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کو بلوچستان حکومت کی طرف سے سال کا بہترین ایوارڈ دیا گیا۔ اور ایک لاکھ روپے بھی مصنف کو عطاء کیے گئے۔

۸۔ ''سیلاب ۲۰۱۰''۔۔۔۔ یہ کتاب ملکی تاریخ کی سب سے خطرناک سیلاب اور اسکی تباہ کاریوں کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ جس میں لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے۔

۹۔ ''ڈیڈھ صدی کی ریل''۔۔۔۔ یہ کتاب ۲۰۱۱ء میں چھپی۔ اس کتاب میں پاکستان ریلوے کے تاریخ اور مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو بھی ادبی طرز اور پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ بلوچستان حکومت کی جانب سے اس کتاب کے لکھنے پر بھی مصنف کو ایک لاکھ روپے انعام سے نوازا گیا۔

۱۰۔ ''میرا شھر کوئٹه (ماضی تا حال)''۔۔۔۔ یہ کتاب کوئٹہ شہر کے حوالے سے تحریر کی گئی ہے۔

۱۱۔ ''بلوچستان ساحل و ماهی گیری''۔۔۔۔ بلوچستان کے ساحل و ماہی گیری کے حوالے سے یہ کتاب تصنیف کی گئی ہے۔

۱۲۔ ''عالمی شخصیات واقعات اور خارجه تعلقات''۔۔۔ یہ کتاب زیر طبع ہے اور اندازاً ۲۰۱۷ء کے آخیر تک چھپ کر آئیگی۔

۱۳۔ ''سانحه ۱۸ اگست۔''دور کتنی هے خورشید محشر۔ کی لو''۔۔۔۔ یہ کتاب ۱۸ اگست ۲۰۱۶ء کو وکلاء پر خودکش حملے کے بارے میں تصنیف کی گئی ہے۔ اور ابھی حال ہی میں چھپ کر منظر عام پر آئی ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ مزاحیہ اور سنجیدہ شاعری پر بھی دو کتابیں زیر طبع ہیں۔ البتہ انھیں ابھی تک کوئی عنوان بھی نہیں دیا گیا ہے۔ اور ایک کتاب طنز و مزاح (ادبی شخصیات اور خاکے) اس کے علاوہ اپنے ایم فل مقالہ پروفیسر مجتبی حسین (فن اور شخصیت) اور پی ایچ ڈی مقالہ عطا شاد (فن اور شخصیت) کو بھی ترتیب دے رہے ہیں اور جلد شائع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ادبی کالموں پر مشتمل ۴۰ سے زیادہ مسودے بھی موجود ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ

Draft

ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے ۱۰۰ سے زائد ڈاکومنٹریاں بھی لکھی۔

ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کو انکی ادبی و علمی خدمات پر متعدد ایوارڈز سے نوازا گیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں قومی ایوان ثقافت کی جانب سے نوجوان شاعر کے طور پر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ لمس کی آہٹ پر ۲۰۰۹ء میں بلوچستان ادبی ایوارڈ ملا۔ قومی سطح پر ۲۰۱۰ء میں گرین جرنلسٹ ایوارڈ اور ۲۰۱۲ء میں تمغہ امتیاز صدارتی ایوارڈ بھی حاصل کیے۔ ان کے علاوہ آئی یو سی این، یو این ڈی، یونیسیف، یونیسکو، پاپولیشن کونسل اور دیگر اداروں کی جانب سے بطور ماہر تعلیم، ادیب، شاعر، دانشور، اور سوشل ورکر کے طور پر ۵۰ کے قریب ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

Draft

حواشی/حوالہ جات:۔

۱) کلی شیخان ہائی سکول اُس زمانے میں مڈل تھا۔

۲) ڈاکٹر فردوس انور قاضی بلوچستان کے مشہور افسانہ نگار رہے۔ بلوچستان میں اُردو زبان وادب کی خدمات کے حوالے سے انکا اہم کردار رہا ہے۔ وہ جامعہ بلوچستان شعبہ اُردو کے چیئرپرسن بھی رہ چکی ہیں۔

۳) پروفیسر مجتبیٰ حسین برصغیر کے معروف اور بہت اہم تنقید نگار، ادیب، محقق اور بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے پہلے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بھی تھے۔ اور اپنی اسی حیثیت سے ۱۹۷۲/۷۳ء سے لے کر اپنے وفات تک اس عہدے پر وہ فائز رہے۔

۴) عطاء شاد بلوچستان کے اُردو اور بلوچی کے معروف صاحب طرز شاعر اور ڈرامہ نگار رہے۔ عطا شاد فن اور شخصیت ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ جو جلد ہی چھپ کر منظر عام پر آئیگی۔

Draft

۵) بالمشافہ گفتگو اور انٹرویو جولائی ۲۰۱۷ء

۶) ایضاً۔۔

۷) ایضاً۔۔

۸) غلام حیدر مرحوم کے والد ریلوے میں کلرک تھے اور عرفان احمد بیگ کے والد گارڈ۔ غلام حیدر نے پی سی ایس کیا تھا اور ۱۹۹۶ء میں نئے نئے کمشنر مقرر ہوئے تھے اور ایک ایکسیڈنٹ میں وفات پاگئے۔

باب دوم:۔ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کی شعری خدمات

(ا) "لمس کی آہٹ" تعارف و جائزہ:۔

(ب) "لمس کی آہٹ" فکری جائزہ:۔

٭عرفانؔ احمد بیگ کی غزل گوئی اور نظم گوئی میں فکری موضوعات

(ج) "لمس کی آہٹ" فنی جائزہ

علم عروض، علم بیان اور علم بدیع اور اسلوب کے حوالے سے عرفان احمد بیگ کی شاعری کا جائزہ

Draft

٭ حوالہ جات

(ا) "لمس کی آہٹ" ایک تعارف ایک جائزہ

"لمس کی آہٹ" ڈاکٹر عرفانؔ احمد کا مجموعہ کلام ہے جو ۲۰۰۹ء کو الحمد پبلی کیشنز لاہور کی جانب سے شائع ہوا۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ۵۰۰ کی تعداد میں چھپنے والی اس کتاب کی قیمت ۲۰۰ روپے مقرر کی گئی ہے۔ اب تک ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کا یہی ایک مجموعہ کلام منظر عام پر آچکا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں تین شعری اصناف یعنی نعت، غزل اور نظم کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں کل ۵۴ غزلیں ۱۸ نظمیں اور دو نعتیں شامل ہیں۔

اس کتاب کا انتساب ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے محبت کے نام کیا ہے اور انتساب میں میر تقی میرؔ کا یہ شعر درج کیا ہے:

میرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں نے ناکامیوں سے کام لیا

میر تقی میرؔ کی اس شعر سے وابستگی عرفانؔ صاحب کی محبت سے وابستگی کا ثبوت ہے۔ محبتوں کی زبان بولنے والے عرفانؔ بیگ نے محبت میں بھی ناکامیوں کا سامنا کیا ہے۔

اِس کتاب کا دیباچہ محمود شام نے تحریر کیا ہے۔ ان کے مطابق "لمس کی آہٹ" کے نام میں بھی انوکھا پن ہے۔ اور اُردو شاعری تو کم از کم تین صدیوں سے کی جا رہی ہے شعری مجموعے ہر روز سامنے آرہے ہیں لیکن مقبولیت کی سند چند ہی حاصل کرتے ہیں۔ عرفان جو دیکھتے ہیں سنتے ہیں محسوس کرتے ہیں اسے غزل کی بدن میں ڈھال لیتے ہیں انکی شاعری سچ بولتی ہے اور اپنے عہد کی سچی تصویر ہے(۱)

"سچے عرفان کی سچی شاعری" کے عنوان سے ظفر ذیشان نے تبصرہ تحریر کیا ہے اور انہوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ "لمس کی آہٹ" عرفان احمد بیگ کی کل شاعری کا دسواں حصّہ ہے۔ جسے راحت ملک، دانیال طریرؔ، افضل

Draft

مراد، وحید زہیر، بیرم غوری، ڈاکٹر فاروق احمد، سرور جاوید، عارف ضیا، علی بابا تاج اور فاروق سرور نے ترتیب دی ہے۔ ظفر ذیشان کے خیال میں اس مجموعے کو پچیس برس پہلے سامنے آنا چاہیے تھا۔ مگر ناکامی عشق کے بعد عرفان صاحب نے مسودہ پبلشرز سے واپس لے لیا اور کہنے لگے کہ میری شاعری ایک شخص کو متاثر نہ کر سکی سچائی کی پہچان نہ کروا سکی اس شاعری کو رہنے دیا جائے اور جب عمر نصف صدی کا قصہ طے کرلے گی تو اس مجموعے کو شائع کروا لونگا اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ کتاب کے سرورق پر حارث خلیق اور پس ورق پر فہمیدہ ریاض کے بھی مختصراً تبصرہ درج ہے۔ عرفان احمد بیگ کی شاعری کے بارے میں حارث خلیق لکھتے ہیں۔

> ”بڑی شاعری میں منتروں کی سی سادگی ہوتی ہے۔ یہ تام جھام، مٹرک، استادی وغیرہ کہنی مشقی اور تکنیک پر عبور کا اظہار تو ضرور ہیں مگر اچھی شاعری پر دلالت نہیں کرتے۔ بیگ صاحب اچھے شاعر ہیں اور ان کی شاعری دل سوزی اور سادگی کا مرکب ہے“(۲)

”لمس کی آہٹ“ کا پیش لفظ عرفان صاحب نے خود لکھا ہے انہوں نے اس مجموعے کے مرتب کرنے کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ روزنامہ جنگ کے مجید اصغر انھیں اس شعری مجموعے کی اشاعت کے لیے اکساتے رہے اور خاص کر راحت ملک کہ جس نے ان سے اس مجموعے کے لیے ہفتوں بلکہ مہینوں مسودہ لکھوایا اور پھر خود یا علی بابا تاج کے ساتھ مل کر پروف ریڈنگ بھی کرلی۔

عرفان احمد بیگ کہتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ محسوس کیا دیکھا اور جھیلا اسے پوری حقیقت اور سچائی کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی کوشش کا نام ”لمس کی آہٹ“ ہے۔

Draft

ب "لمس کی آہٹ" فکری جائزہ:۔

عرفانؔ احمد بیگ کی شاعری کم سے کم ۴۷ سال پر محیط ہے۔ان کا یہ علمی وادبی سفر اب تک جاری ہے۔ ڈاکٹر عرفانؔ بیگ نے ۱۹۷۰ء سے شاعری شروع کی۔ظفر خانؔ نیازی، عطا شادؔ اور عین سلام سے شاعری میں فیض حاصل کیا۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ کسی بھی شاعر کے ابتدائی کلام میں پختگی اور غیر معیاری پن موجود ہوتا ہے۔مگر وقت کے ساتھ ساتھ فکری میلان میں تبدیلیوں کے باعث جب شاعر پختگی کے منزلوں تک پہنچ جاتا ہے، تو اس کے ہاں شاعری میں بھی فکری طور پر تبدیلی آتی ہے۔ چنانچہ جب ہم "لمس کی آہٹ" کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ عرفان احمد بیگ کی نمائندہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ جنھیں انتخاب کرکے شائع کیا گیا ہے۔ کیونکہ "لمس کی آہٹ" پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انکی تمام تر غزلوں اور نظموں کا رنگ وآہنگ تقریباً یکساں ہے۔انداز بیان خیالات وجذبات، افکار، الفاظ کی نشست و برخاست، تشبیہات، استعارات سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ملتے ہے۔اور پختہ تر اور منجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔انکی شاعری مکمل طور پر روایتی اور معروف مضامین سے خالی تو نہیں البتہ ان روایتی مضامین اور خیالات میں عرفانؔ احمد بیگ تجربے کرتے نظر آتے ہیں۔

Draft

عرفانؔ احمد بیگ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔اور غزل انکی پسندیدہ صنفِ شاعری ہے۔البتہ غزل گوئی کے ساتھ ساتھ انہوں نے نظم نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔"لمس کی آہٹ" کا زیادہ تر حصہ بھی غزلوں پر ہی مشتمل ہیں۔

اُردو شاعری کی روایت کافی قدیم ہے اور یہ روایت رہی ہے کہ عموماً ہر شاعر نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ہی غزل لکھنے سے کیا۔ابتدائی غزلوں سے لے کر دورِ جدید کی غزلوں اور نظموں تک کا یہ سفر کئی صدیوں پر مشتمل ہیں۔اس سفر میں معنوی اور ہیئتی دونوں سطح پر کافی تجربات بھی ہوئے۔اور ہر بڑے شاعر نے روایت سے بغاوت کرکے اپنی الگ راہ متعین کرکے اُردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے میں کردار ادا کیا۔

دوسرے اصناف سخن کی طرح غزل میں بھی کئی تجربے ہوئے۔اُردو غزل نے اپنے چراغ فارسی زبان و ادب سے روشن کیے۔غزل درحقیقت قصیدے کی تشبیب کی ہی ایک شکل ہے۔تشبیب کو قصیدے سے الگ کرکے غزل کی شکل دینے کا سہرا حکیم سنائیؔ کے سر جاتا ہے۔اس بارے میں طارق ہاشمی کی رائے ہے۔

> ”سنائی کا یہ ذہنی انقلاب' قصیدہ گوئی سے گریز اور غزل کو علاحدہ صنفِ شاعری بنانا بھی کسی ایک شخص کا ذاتی و داخلی معاملہ نہیں ہے بلکہ غزل کے ابتدائی تاروپود سے اس عہد کے تاریخی و عمرانی تغیرات کا گہرا تعلق ہے جن کے ادراک کے لیے ہمیں صنفِ قصیدہ کی ماہیت ومزاج پر معروف تنقیدی زاویوں سے گریز کرنا ہوگا۔“(۳)

خیر یہ الگ بحث ہے اور یہاں صدیوں پر محیط قصیدہ اور غزل کی اس روایت کا ذکر کرنا مناسب بھی نہیں۔البتہ غزل کے بارے میں ایک اجمالی جائزہ پیش ہے۔

غزل کی ایک حیثیت بطور عربی لفظ ہے۔جسے حسن وعشق کی باتوں،گیتوں اور قصّے کہانیوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ غزل کی دوسری حیثیت بطور اصطلاح موسیقی ہے،موسیقی کے ایک راگ کا نام غزل ہے۔غزل کی تیسری اصطلاح بطور تغزلِ قصیدہ ہے۔تغزلِ قصیدہ کو تشبیب،نسیب اور غزل تینوں معنوں میں منسوب کیا گیا ہے۔غزل کی چوتھی حیثیت بطور اصطلاح شاعری ہے۔یعنی ایک ایسی صنف سخن جو مخصوص عناصر ترکیبی پر مشتمل ایک شعری ہیئت رکھتی ہے۔(۴۔)

فارسی روایات کی وجہ سے اُردو غزل میں بھی فارسی کے روایتی مضامین در آئے۔غزل کو ہمیشہ سے حسن وعشق کی واردات،انسان کی کامرانی و نامرادی کی داستان،تصوف اور معرفت کی روداد،پیار و محبت کے قصے،بہار و خزاں،قفس و آشیانہ،تاریخی اور روایتی عاشق کی دلفریب کہانیوں،انسان کی بے ثباتی،اپنوں اور غیروں کی بے وفائی اور انسانی زندگی کی حقیقتوں سے منسوب کیا گیا ہے اور یہ تمام موضوعات آج بھی غزل کا حصہ ہیں انکے بغیر غزل کا تصور ممکن ہی نہیں۔غزل کے موضوعات کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف کمال لکھتے ہیں:

Draft

"غزل دراصل زندگی اور اس سے متعلق تمام مسائل اور
معاملات اور کرب و دکھ کی ترجمانی کے لیے ایک ایسی صنفِ شاعری
ہے، جس میں وارداتِ قلبی کے ساتھ ساتھ عصری کرب کا اظہار بھی
نہایت عمدگی سے کیا جا سکتا ہے"(۵)

غزل میں جدید شعراء نے روایتی موضوعات کو ایک نئی شکل دے کر غزل کی معنوی سطح میں تبدیلیاں لائی ہیں۔ عرفان احمد بیگ بھی انہی شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے غزل اور نظم کی روایتی قالب میں فکر و خیال کے حوالے سے اچھوتے مضامین باندھے ہیں۔ ان کی غزل روایتی اور جدید موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے ایک حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ فنی حوالے سے عرفان احمد بیگ کے ہاں غزل روایتی قالب میں موجود ہے۔ مگر فکری حوالے سے اس میں بہت تنوع ہے۔

۷۰ء کے دہائی کے بعد اُردو غزل میں انسانی تہذیب و تشخص اور سماجی مسائل کو غزل کا خاص موضوع بنایا گیا۔ عرفان احمد بیگ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بھی ۷۰ء کے بعد کی غزل کے جدید موضوعات کو روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ اپنایا۔ انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن، اقدار اور تشخص جیسے جدید موضوعات کو اپنی غزل میں اس طرح سمویا کہ وہ ایک جدید شاعر کہلانے لگے۔

غزل کی روایتی موضوعات میں سے حسن و عشق اور محبت ایک اہم موضوع رہا ہے۔ ولیؔ سے لے کر جونؔ ایلیا تک ہر شاعر نے کسی نہ کسی طرح سے اس موضوع کو اپنے مزاج کے مطابق اپنایا۔ کسی شاعر نے حسن کو محبوب ارضی کی صورت میں دیکھنے کی کوشش کی۔ کسی نے کائنات کے جلوؤں کی صورت میں محبوب سماوی سے اس کے ڈانڈے ملائے۔ شروع ہی سے یہ غزلیہ شاعری کی روایت رہی ہے کہ اس میں حسن و عشق اور محبت جیسے مضامین باندھے گئے اور اب اس روایت سے اجتناب نہیں برتا جا سکتا۔ البتہ شعوری طور پر نہ صرف کئی شعراء نے ابتدائی کلام کے بعد حسن و عشق کے مضامین سے صرف نظر کیا بلکہ سماجی مسائل کو بھی ان پر فوقیت دی۔

عرفان احمد بیگ کی شاعری میں بھی حسن و عشق کا موضوع خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کے زیادہ تر

Draft

موضوعات عشق ومحبت ہی کے ہیں۔البتہ نظموں میں انکار رجحان کچھ مختلف ہیں۔عرفان بیگ،حسن وعشق،جذبات و احساسات اور خیالات وافکار کو اتنے مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ حسن وعشق ہی ان کی شاعری کا اصل محور لگنے لگتا ہے۔ انہوں نے حسن وعشق کے موضوع کو داخلی کیفیات کے طور پر برتا ہے۔اور داخلی کیفیات کو اسطرح سے استعمال کیا ہے کہ قاری انھیں پڑھ کر اپنی داستان سمجھنے لگتا ہے۔

ہوا نے موسموں کی معرفت سے
ہمیشہ ہی تری خوشبو لکھی ہے

خوشبوؤں کا یقین آیا ہے
شہر میں اک حسین آیا ہے

عرفان احمد بیگ کے کلام میں روایتی حسن وعشق کے موضوع تو ملتے ہیں۔مگر انہوں نے ان عاشقانہ مضامین کو نئے ڈھنگ سے باندھا ہے۔انہوں نے جس روپ سے زندگی کو دیکھا اسی روپ سے اس کی تصویر کشی بھی کی۔

لمحے بدل گئے ترے ثانی بدل گئے
سوچا تجھے تو درد کی معنی بدل گئے

وہ جس کے ساتھ دل کے مرحلے ہیں
وہی خاموش لہجے بولتے ہیں

تری آنکھوں سے نظروں کا تعلق
محبت کے ابھی کچھ سلسلے ہیں

Draft

عرفانؔ احمد بیگ کی شاعری میں عشق و محبت انسانی تجربہ بن کر ابھرتا ہے۔ اس موضوع پر اُردو شاعری میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے اور اس قدر تنوع سے لکھا گیا ہے کہ ہر نو آموز شاعر نے انہی مضامین پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہر نو آموز شاعر کو خیال و بیان کے اس پہلو کو دیکھنے، سمجھنے اور اپنے طور پر کہنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن عرفانؔ صاحب کے ہاں عشق و محبت کا یہ جذبہ پختہ تر ہو کر سامنے آتا ہے۔ عشق و محبت کی مختلف کیفیات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

سحر لہجہ تری پلکوں کا اٹھنا
جھکیں تو گہری کالی شام آنکھیں

آنکھوں میں ایک خواب کے ذرات رہ گئے
تجھ سے تعلقات کے اثرات رہ گئے

عرفانؔ احمد بیگ کی شاعری حسن و عشق کے تمام مراحل کو پیش کرتی ہے۔ حسن و عشق کے موضوعات کو پیش کر کے انہوں نے غزل کے رنگِ تغزل کو برقرار رکھا ہے۔ تغزل کا رنگ و آہنگ انکی شاعری کا خاص وصف ہے۔ حسن و عشق کا موضوع انکی شاعری کا ایک پہلو تو ہو سکتا ہے مگر مکمل طور پر انکی شاعری کا احاطہ نہیں کرتا۔ کیونکہ انکی شاعری رومان کی ایک ایسی لہر ہے جو لمس کی آہٹیں سنا کر قاری کو فکر کی دعوت دیتی ہے۔

عرفانؔ بیگ کی شاعری میں عشق و محبت کے محرکات دراصل انکے اپنے ذاتی تجربے ہیں جو انہوں نے محسوس کیے اور لکھے۔

آتشیں درد کا دل بھنور ہو گیا
میں ترے عشق میں در بدر ہو گیا

Draft

خون دل ہمارا بھی رائیگاں نہ جائے گا
راہ عشق کو ہم بھی دیکھنا اجالیں گے

عرفانؔ احمد بیگ ایک سچے عاشق ہیں۔ اور عشق کی کسک کو سچے من سے محسوس کرنے والا ہی عاشقانہ موضوعات کو بہتر طور پر شعر کے قالب میں ڈھال سکتا ہے۔ عشق عرفانؔ بیگ کے ہاں صرف ایک موضوع ہی نہیں بلکہ ایک تجربہ بھی ہے۔ اور قاری انکی شاعری میں اس تجربے کی تمام حرارتیں اور جذبے سچے دل سے محسوس کرسکتا ہے۔ انکے ہاں عشق جسم کے ملاپ کا نہیں بلکہ روح کا سنگم ہے۔

بہت قریب رہے تجھ سے سانولی لیکن
بڑے وقار سے کچھ فاصلوں کے ساتھ رہے

تیرے میرے پیار کا سچا رشتہ ٹوٹ گیا
جسم بچا پر روح کا کوئی حصہ ٹوٹ گیا

آؤ سانسوں کی اوٹ میں بیٹھیں
لمس کی باطنی کو فرض کریں

کرچی لمحوں کی حدت کا میٹھا میٹھا درد
میرے قرب کا موسم زخمی تیری باس کی دھند

عرفانؔ بیگ کے ہاں محبت کا یہ خالص جذبہ نہ صرف انکی غزلوں بلکہ نظموں میں بھی ملتا ہے۔ نظم "محبت کی روح" اس کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم میں محبت کے داخلی احساسات و کیفیات ظاہر کرتے

Draft

ہیں کہ عرفانؔ بیگ کے ہاں محبت، تقدس اور بندھن کا رشتہ ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

موج در موج میرے عکس تری آنکھوں میں
آگ شفاف سے پانی میں لگا رکھی ہے

تو نے گھبرا کے گھنی پلکوں سے ڈھانپا مجھ کو
تیرے ہونٹوں کے کناروں سے ذرا دور فضا

لمس کی لے میں مہکتی ہوئی بولی مجھ سے
اتنا حساس تخیل ہے ذرا ہولے سے

سانس کی لے ہے کہیں توڑ نہ ڈالے ہم کو
نہ تو یہ جسم کا رشتہ ہے نہ دھن کا رشتہ

یہ تقدس کا ہے بندھن کہ ہے من کا رشتہ
میں ترے پاس یونہی آتی رہوں گی لیکن

تو تخیل کی طہارت یونہی رکھنا آباد

Draft

اُردو شاعری کی روایت رہی ہے کہ محبوب کے حسن اور سراپا کو ہمیشہ سے غزل کا خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ اور شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ اردو غزل اور نظم دونوں میں شعراء نے جمال پرستی سے کام لیا ہے۔ اسی بناء پر ولی دکنی کو جمال پرست شاعر کہا جاتا ہے۔ عرفانؔ بیگ کے ہاں بھی محبوب کی سراپا نگاری ملتی ہے۔ مگر ان کا یہ محبوب روایتی غزل کے محبوب کی طرح خیالی نہیں بلکہ زندگی میں بھی وہ اِس محبوب کے دیوانے ہیں جو انہی کی طرح کا گوشت پوست کا انسان ہے۔ ان کے محبوب کے احساسات انسانی محسوسات سے مختلف نہیں ہیں۔ غزل میں روایتی طور پر محبوب کے سراپا، حسن اور ناز و ادا کو حد درجہ مبالغہ آرائی سے بیان کیا جاتا تھا بلکہ اب بھی بیان کیا جاتا ہے۔ مگر جدید غزل گو شعراء کے ہاں یہ روایت ذرا مختلف ہے۔ جدید غزل میں محبوب ایک جیتا جاگتا اور اسی دنیا سے وابستہ کردار ہے۔ عرفانؔ بیگ جدید غزل کے علمبرداروں میں سے ایک ہیں۔ اس لیے ان کا محبوب بھی اسی دھرتی کا رہنے والا ہے۔

عرفانؔ بیگ کی غزلیں پڑھ کر محبوب کا خالی حلیہ محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے خدوخال اور نقوش سے ابھرنے والے احساس بھی اجاگر ہوتے ہیں۔

وہ پہلی ملاقاتیں گھبرائی ہوئی لڑکی
اک سہما ہوا لڑکا شرمائی ہوئی لڑکی

اک جامنی آنچل میں کرنوں کے تعلق سے
اُس سانولی رنگت میں شرمائی ہوئی لڑکی

ذہن کی نسوں میں وہ سوچ کو سجاتا ہے
ایک سانولا چہرہ شہر دل کا داتا ہے

عرفانؔ بیگ محبوب کے سراپے کو اس قدر خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو سرو کے قد و کاٹھ اور گلاب کی تازگی سے تشبیہہ نہیں دیتے بلکہ اسے سانولی پکارتے ہیں۔

سانولے رنگ کی میحائی
آج اے دل! کدھر گئی آخر

ہاں مرے عشق کی تمازت سے
سانولی تھی نکھر گئی آخر

اے سانولی وہ دن وہ ماہ و سال یاد ہیں
ہم بھی حسیں تھے اور شبابوں کے ساتھ تھے

Draft

سانولی تجھ کو خبر کیا کہ تیرے عشق میں ہم
کس طرح درد سے اور دل سے لپٹ کر بیٹھے

جن رنگوں میں گہرائی پائی جاتی ہے اور سانولا پن پایا جاتا ہے۔ انھیں عرفانؔ بیگ اپنے محبوب کی رنگت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عرفانؔ بیگ کی یہی جدت ہے کہ وہ محبوب کو کبھی، لچکتی شاخ، خوبانی جیسے گہرے لال سانولے سرخ گال، بادام جیسی آنکھیں اور سنجدی کی کوئی شاخ قرار دیتے ہیں:

بدن کوئی لچکتی شاخ جیسا
خوبانی گال اور بادام آنکھیں

سنجدی شاخوں کے جیسا سانولا روشن بدن
اور اس پر چاندنی میں جسم سے لپٹی ہوا

Draft

عرفانؔ بیگ اپنی سانولی کا ذکر غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی کرتے ہیں نظم "مری سانولی" کے چند مصرعے ملاحظہ ہو:

تری آسمانی سے آنکھ میں
وہ افق افق، وہ پلک پلک
جو چراغ غم نے جلائے تھے
مجھے یاد ہے وہ گھڑی گھڑی
مری سانولی، مری سانولی

غزل کے روایتی موضوعات میں سے ایک محبوب کی بے وفائی اور سنگدلی بھی ہے مگر عرفانؔ صاحب کے ہاں

یہ موضوع عجیب انداز میں برتا گیا ہے۔ مثلاً عرفانؔ بیگ نہ رقیب کا گلہ کرتے ہیں اور نہ محبوب سے شکایت اور نہ ہی محبوب کو بے وفا کہہ کر پکارتے ہیں بلکہ وہ اس بے وفائی کی تہمت اپنے سر لیتے ہیں:

بے وفائی کی آخری تہمت
دیکھ عرفانؔ کے سر گئی آخر

عرفانؔ احمد بیگ نے اِس محبوب کو شدت سے چاہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عشق میں کامیاب نہ ہو سکے مگر انہوں نے عشق میں دشت نوردی کرنے کی بجائے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انکے ہاں ہجر ادھورا ہے۔ یعنی یہ ہجر محبوب کی طرف سے نہیں دیا گیا بلکہ اس ہجر میں زمانے اور روایت کا ہاتھ ہے۔ اس لیے وہ محبوب کو بے وفائی کا الزام دینے کی بجائے سماجی حالات میں اپنی عشق کی ناکامی کا جواز تلاش کرتے ہیں اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں مگر اسے ہجر کا غم ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

اس نے چاہا تھا گلے لگ جائے
پر اسے گھات کا ابہام رہا

نہ چبھائیں کانچ کی چوڑیاں نہ بچھڑ کے مجھ سے وہ روسکی
اس بے لباس سے عہد میں یہ روایتیں بھی گزر گئیں

عرفانؔ احمد بیگ کے ہاں وصل جسم کے ملاپ کا نام نہیں بلکہ روح کے ملن کا نام ہے۔ ان کے ہاں وصل کی شدت ایک لمس کی سی ہے اور یہی لمس کا احساس انھیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ وصل کا یہ انداز بہت ہی دلفریب ہے۔

میرے بستر کی نرم سلوٹ پر
ترے ٹوٹے بدن کی انگڑائی

Draft

اس حوالے سے ڈاکٹر فاروق احمد لکھتے ہیں کہ:

"رومانیت کی ایک لہر عرفانؔ احمد بیگ کی شاعری میں نظر آتی ہے لیکن اس رومانیت میں بھی وصال کا منظر جھلملا ہوا ہے"(۶)

ہجر عرفانؔ بیگ کے ہاں حزن وملال کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ عرفانؔ بیگ ہجر کو عشق کا ایک کانٹوں سے بھرا راستہ سمجھتے ہیں جس سے گزرنا ناگزیر ہے۔

سخت تھی شب تری جدائی کی
یار ! لیکن گزر گئی آخر

ہجر کی یہ منزل عرفانؔ بیگ کے ہاں درد اور تنہائی کی کیفیات کو جنم دیتی ہے۔ عشق کے ساتھ ساتھ زندگی کی شقاوت تجربوں اور آرزؤں کی عدم تکمیل نے انھیں درد اور تنہائی پر محیط ایک بے کراں صحرا میں لا کر چھوڑ دیا ہے۔ ایک طرف عشق نے درد کی کسک دل میں بٹھا دی ہے تو دوسری طرف زندگی کا تلخ چہرہ جو انہوں نے معاشی جدوجہد کے دوران دیکھا۔ تو اس جدوجہد میں انہوں نے اپنا رفیق کار صرف اور صرف تنہائی کو بنا لیا ہے۔

بند کمرے میں کتابیں لے کر
مدتوں تجھ کو پڑھا تھا میں نے

رات میں بلب کی دھندلی کرنیں اور اکیلی تنہائی
اک کمرہ اور چند کتابیں اور ہر سو پھیلی تنہائی

تیری یادوں کو ہمیشہ اس لیے رکھتا ہوں پاس
ورنہ کمرے میں فقط تنہائیاں رہ جائیں گے

Draft

عرفانؔ احمد بیگ تنہائی پر محیط اس بے کراں صحرا میں بھی یاد یار سے غافل نہیں۔ بلکہ بند کمرے میں مدتوں اس یاد کے سہارے گزارتے ہیں، اور اس یاد کے ہر نین و نقش کو دل میں بٹھاتے ہیں۔ اگر چہ یہ تنہائی انکی ذات کی تنہائی ہے مگر کبھی کبھی اس تنہائی کی لہریں انکے بند کمرے سے نکل کر سڑکوں کی تارکول تک پہنچ جاتی ہے

سڑکوں کی تار کول میں اب بھی خلوص ہے
اس شہر میں کسی سے کبھی دوستی سی تھی

میری تنہائی پاگل ہو چکی ہے
یہ میرا شہر کیوں سوتا نہیں

شہر کی بھیڑ میں لوگ اکیلے خالی خالی میلے
جیون سوچ کا گورکھ دھندہ اور پہیلی تنہائی

شہر بڑھے اور بڑھتے بڑھتے کچھ اتنے ویران ہوئے
بستی بستی گھر گھر آکر خود سے کھیلی تنہائی

جہاں تک عرفانؔ بیگ کی شاعری کا تعلق ہے۔ تو اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک غم جاناں اور دوسرا غمِ جہاں اور وطن۔ غمِ جاناں کے موضوعات میں ان کے اپنے ذاتی عشق و محبت کے کرب اور زندگی کے کریہہ چہرے اور جد و جہد کی تخلیقات شامل ہیں۔ لیکن یہ محرومیاں اور کرب، ذاتی غم بن کر نہیں رہ جاتے بلکہ سماجی غم کے رشتوں سے منسلک ہو کر غمِ مشترک کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ جنھیں ہم غمِ دوراں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ غم وطن اور غم جہاں انکے ہاں مختلف ہے۔ اسطرح کے اشعار موضوع کرتے وقت ان کا لب و لہجہ ان کے تجربات اور تلخی زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ اس کی وجہ شاید اس کی حساس طبیعت اور ترقی پسند شاعری کی طرف رجحان ہے کہ

Draft

وہ ذات کے گوناگوں مسائل سے نکل کر وطن کی بو باس اور کائناتی المیوں تک جا پہنچتا ہے۔اور انکا درد عالمی درد بن کر ابھرتا ہے۔

کائناتی عذاب سہہ لینا
عالمی درد ہم سفر کرنا

عرفان احمد بیگ کی شاعری میں بسیار تلاش بھی کوئی خاص شعر شادمانی و سرخوشی کے موضوعات پر نہیں ملتا۔مگر پھر بھی غم کی کیفیت انھیں زندگی سے فرار کا موقع نہیں دیتی۔وہ زندگی سے آنکھیں ملا کر چلتے ہیں۔غم کی انہی کیفیات نے ان کی شاعری میں معنویت، اثر پذیری، دلکشی، شدت جذبات، اور زبان و بیان کی رنگینیاں لے آیا ہے۔ ذات کی حدوں سے نکلنے والا یہ کرب اجتماعی صورت لے کر مٹتی تہذیبوں کی عقدہ کشائی کر لیتا ہے۔غم کی یہ کیفیت انھیں قنوطیت کی طرف مائل نہیں کرتی۔انکے کلام میں رجائیت اور امید پرستی کی کیفیت باقی ہے جس کی مثال ان کی نظم "یقین کی ساعت قریب تر" ہے۔

عرفان احمد بیگ شہری زندگی کے ان کریہہ چہروں کو بے نقاب کرتا ہے۔جنہوں نے دوستی اور رشتوں کا خون کر کے انسان کو تنہائیوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔تنہائی کا یہ احساس عرفان بیگ کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں بھی موجود ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

آج اپنی کمی کو فرض کریں
عمر کی زندگی کو فرض کریں

آؤ انسان کو کریں معلوم
آؤ اس آدمی کو فرض کریں

ایک گھر تھا انہی گلیوں میں کہیں
ڈھونڈتا ہوں کہ پتا یاد نہیں

Draft

صبح کو دفتر شام کو گھر میں رہتا ہوں
یوں شہروں کے بیچ سفر میں رہتا ہوں

ساتھی روند کے جو آگے بڑھ جاتے ہیں
انسانوں کے اس لشکر میں رہتا ہوں

اس حوالے سے ڈاکٹر فاروق احمد لکھتے ہیں:

"عرفان احمد بیگ آج کے فکری تناظر میں جب انسان کو دیکھتے ہیں تو انھیں ایسے کھوئے ہوئے آدمی کو ڈھونڈنا پڑتا ہے جو ماضی میں کہیں کھو چکا ہے۔ شدید گھٹن کے اس ماحول میں انسان کی دریافت مشکل ہوگئی ہے اور اب ہمیں ایک ایسے آدمی کو فرض کرنا ہی پڑتا ہے جو شاید ذہنیتوں سے نکل کر زندگی کو توانائی انسان کو سچائی سے ہمکنار کرے۔(۷)

تنہائی کے اس احساس میں عرفانؔ بیگ اپنے آپ کو فرض بھی کر لیتے ہیں اور کبھی آئینہ دیکھ کے اپنے آپ سے ٹکرا بھی جاتے ہے۔ اور کبھی لمس میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور کبھی کبھی لمس سے بھی کٹ کر خود میں سمٹ جاتے ہیں۔

ہجر، درد اور تنہائی نے عرفانؔ احمد بیگ کے ہاں خوابوں کو جنم دیا ہے۔ اور اپنی شاعری میں وہ انہی خوابوں کو تعبیر دینے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ ایک دردمند انسان ہیں اور اسکے ہاں جو محرومیاں ملتی ہیں وہ انکی ذات کی محرومیاں ہیں۔ معاشی مسائل جس طرح انھیں پیش آئے۔ زندگی کے بے رحم تجربوں کو جس طرح انہوں نے جھیلا وہ انکے ہاں شکست وریخت کا تصور بن کر ابھرتے ہیں۔ جن خواہشات کا زندگی کے بے رحم وقت نے خون کیا۔ عرفانؔ صاحب نے انہیں شعری پیکر دے کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں زندگی محض زندہ رہنے کا نام نہیں بلکہ ایک جدوجہد ہے۔ ذات کے گوناگوں مسائل کے باوجود زندگی اور سماج سے آنکھیں ملا کر جینے کا حوصلہ عرفانؔ بیگ کو خوب آتا ہے وہ غم میں جینے کا سلیقہ رکھتے

Draft

ہیں۔ان کی شاعری انسانی حقیقتوں سے قریب تر کی شاعری ہے۔وہ محض واردات قلبی کے شاعر نہیں بلکہ شعوری طور پر شعر کہتے ہیں۔اسی لیے "لمس کی آہٹ" میں ان کی شعوری شاعری کی جھلک بہت زیادہ ہے۔اور شاید اسی لیے عرفان احمد بیگ کی غزلیں اردگرد کے ماحول، سماجی اور سیاسی حالات اور انسانی زندگی کا نوحہ کرتی نظر آتی ہیں۔

دیکھتا ہوں میں گرتے ہوئے انسانوں کو
پاؤں میں گرتا ہوا سر نہیں دیکھا جاتا

سوچنا ، سوچ کر سمٹ جانا
اپنی زندہ ضرورتوں کی طرح

زندگی سے جدوجہد انکی شاعری کا سب سے اہم وصف ہے اور انکے فلسفیانہ اور فکر آگیں موضوع بھی یہی ہے۔وہ غزل اور نظم دونوں میں ان موضوعات کو برتتے ہیں۔عرفان بیگ اپنی عہد سے جڑے رہتے ہیں انکی یہی عصری حسیت انکی شاعری میں نئے امکانات اور تلاش کی راہیں کھول دیتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں:

پگھلتے لوگ جلتی بستیوں میں
ترقی کے سفر کی تلملاہٹ

وہاں ملبے کی بولی لگ رہی تھی
میں گرچہ شام کو گھر آ گیا تھا

اب آدھی قیمتوں پر بک رہا ہوں
میں پوری قیمتیں ٹھکرا گیا تھا

نئی تہذیب نے انسانوں کے بجائے مشینیں پیدا کی ہیں۔مادی آسائشوں نے رشتوں کی تجارت کر کے انسان

Draft

کی داخلیت کو ختم کر دیا ہے۔ انسان صرف مادی خواہشات کے پیچھے غلام بن کر رہ گیا ہے۔ یہ خارجیت انسان کو بے حس کر دیتی ہے اور یہی بے حسی عرفان احمد بیگ کے کلام کا خاص موضوع ہے۔ "لمس کی آہٹ" کی اکثر غزلیں رومانی مزاج کے حامل ہیں۔ مگر ان غزلوں میں بھی وہ ایسے شعر موزوں کر لیتے ہیں کہ جن سے انکی ترقی پسندی کی فکر واضح ہو جاتی ہے وہ لکھتے ہیں:

جہاں پہ کھیت اور پگڈنڈیاں تھیں
وہاں لکھا گیا "رستہ" نہیں ہے

جلاوطنی ہو شاید موت ہو پھر
مسلسل گھر بدلتا جا رہا ہے

میرے بچے ہیں بیٹھے کوڑا داں پر
کوئی تختی کوئی "بستہ" نہیں ہے

فیصلے فیصلے کہلائے نہیں
ایسے حالات کا ابہام رہا

عرفان احمد بیگ انسانی رشتوں کی قدر بھی جانتا ہے اور روایات کی پاسداری کرنا بھی۔ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات زندگی سے اخذ کرتے ہیں بقول فہمیدہ ریاض:

"ان کی نظموں اور غزلوں میں دردمندی کا جذبہ تازگی اور نازک خیالی کے ساتھ پڑھنے والے تک پہنچتا ہے۔"(۸)

عرفان بیگ کے ہاں غزل اپنی تمام تر رعنائیوں میں موجود ہیں۔ انکی غزلوں میں روایت اور جدت کا سنگم

Draft

موجود ہے۔غالباً اُن کی شاعری انکی اپنی ذات کا بیان بھی ہے اور اس سماج کا نوحہ بھی۔وہ ایک ترقی پسند سوچ کے مالک ہیں۔ان کی نظموں اور غزلوں میں ارد گرد کا ماحول سانس لے رہا ہے۔وہ اس شور آگیں ماحول سے گھبرا کے بھاگ نہیں جاتے بلکہ اسے شعروں میں ڈھال کر لوگوں کو ایک فکر سے آشنا کر دیتے ہیں۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:۔

سانحہ ہے کہ میرے دیس کو اب
کوئی بخشش کی دعا یاد نہیں

میرے ماتھے پہ زمین کا بوسہ
آج بولے ہے خدا یاد نہیں

ہونٹ مسکائیں تو تڑخیں گے لہو ہو جائیں گے
میرے بچوں کے لبوں سے اب ہنسی چھن جائے گی

ابتداء میں اُردو نظم صرف فطری مناظر تک ہی محدود تھی۔انجمن پنجاب کے بعد ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق تحریک کے زیر اثر اُردو نظموں میں جدت آئی۔ترقی پسندوں نے نظم کا رشتہ سماج سے جوڑا جبکہ ارباب ذوق کے علمبرداروں نے نظم کو خالص بیان ذات ہی سمجھا اور اسے ویسے ہی برتنے کی کوشش کی۔ترقی پسندوں میں فیض احمد فیضؔ،احمد فرازؔ،مجازؔ اور ساحرؔ جیسے شعراء نے اردو غزل اور نظم میں خالص ترقی پسند سوچ کو اپنایا۔اور دوسری طرف میراں جی،ن۔م راشد اور حلقہ کے دوسرے لوگوں نے نظم کو بہت زیادہ اہمیت دی۔عرفانؔ احمد بیگ بھی فکری طور پر ترقی پسند تحریک سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔اس لیے انکی نظمیں جذبات،احساس اور زندگی کے تجربات سے لبریز ہیں۔الفاظ کی نشست و برخاست،موضوع کا انتخاب،نظموں کی روانی اور بے ساختگی نے عرفان کو زندگی سے اور قریب تر کر دیا ہے لہذا وہ زندگی کو مزید گہرائی سے دیکھنے لگے۔جہاں انکی غزلوں میں رومان پسندی زیادہ ہے وہیں انکی نظموں میں ترقی پسندی کا عنصر ملتا ہے۔"لمس کی آہٹ" میں ۱۸ نظمیں شامل ہیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ماں ۲۔نئی ہجرتیں ۳۔محبت کی روح ۴۔آنسو ہیں یہ ۵۔تیرا نام لکھا ہے ۶۔مسکراہٹ ۷۔یقین کی ساعت قریب تر

Draft

ہے ۸۔بے اماں بستی ۹۔تعبیر کوئی ۱۰۔وہ کیا بات ہے؟ ۱۱۔خوشبو، پھول، پرندے، بچے ۱۲۔میری سانولی ۱۳۔دھواں ۱۴۔نظر کی روشنائی سے ۱۵۔لمس کی آہٹ ۱۶۔ناخدا اور خدا خاموش کیوں؟ ۱۷۔یاد کی ساعت ۱۸۔میرا شہر مجھے واپس کردو۔

یہ تمام نظمیں ہیئت کے اعتبار سے پابند اور آزاد ہیں۔غزل کی نسبت عرفانؔ احمد بیگ نے نظم نگاری کم کی ہے مگر بہت ہی جاندار نظمیں لکھیں ہیں۔ان کی نظموں کو پڑھ کر یہ اندازا ہوتا ہے کہ ان کی شاعری تصویر کے دو رخوں جیسی ہے۔کہ جس کے ایک رخ پر عشق و محبت کی رنگینیاں، ہجر و وصل کی تڑپ، سنگدلی و محبوب کی بے وفائی کے آمیزے سے تیار ایک ہیولہ بنا ہوا ہے اور دوسرے رخ پر عصر حاضر کا کرب اپنی تمام تر حسیّات کے ساتھ موجود ہے۔اس کرب کو عرفانؔ نے خود محسوس کیا ہے اور ہر ذی شعور اور حساس انسان بھی محسوس کر سکتا ہے۔جہاں وہ غزلوں میں یہ کہتے نظر آتے ہیں۔

یہ دوہرا ظلم ہے محکوم جب بنایا تھا
تو مجھ کو پوری طرح بے بسی بھی دے دیتا

یا

نشیبوں میں کٹھن پھر زندگی ہے
پہاڑوں پر بڑی بارش ہوئی ہے

وہیں اپنی نظموں میں بھی عموماً انہی قسم کے خیالات پیش کرتے ہیں۔جو انسان کی ذات اور اس کے مسائل کو پیش کریں۔نظم ”نئی ہجرتیں“ میں وہ تیسری دنیا کے انسانوں کو کرایہ دار مکینوں کی علامتی انداز میں پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:۔

ہم کرائے دار مکین تھے، تمھی مالکان زمین ہو
وہ مکان تم نے بنائے تھے، وہ محلے ہم نے بسائے تھے
وہ بزرگ میرے غریب تھے، وہ غریب تھے وہ عجیب تھے
وہ نگر نگر وہ گلی گلی جو درخت ان نے لگائے تھے
انھی سبز پیڑوں کی چھاؤں میں

Draft

وہ جوانیاں، وہ کہانیاں

کسی پیڑ پر کوئی نام تھا

کسی شاخ پر تھا وہ جھولنا

وہ درخت سارے ہی کٹ گئے

وہ نشان سارے ہی مٹ گئے۔۔۔۔۔۔۔

عرفانؔ بیگ کی ترقی پسندی بھی دوسرے شعراء سے الگ ہے۔ وہ دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح انقلاب، انقلاب اور انقلاب کا نعرہ نہیں لگاتے بلکہ اپنے دھیمے مزاج سے زندگی کے بے رحم تجربوں کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ عرفانؔ جوشؔ اور فیضؔ کی طرح تاج اچھالنے اور تخت گرانے کی باتیں نہیں کرتے بلکہ نرم مگر کاٹ دار لہجے میں کہتے ہیں کہ:

میرا شہر مجھے واپس کر دو

وہ شہر کے جس میں خوشبو کے

کچھ ڈیرے تھے

کچھ پھیرے تھے

وہ شہر کہ جس میں یاری تھی

غم خواری تھی

ہر صورت اچھی لگتی تھی

ہر شکل یہاں کی پیاری تھی

وہ ٹھنڈی سڑک کہ جس پہ کبھی

ہم ڈھلتی شام سایوں میں

کیا خوش تھے خراماں پھرتے تھے

Draft

میرا شہر مجھے واپس کر دو

وہ شہر کہ جسم میں لوگوں کو

نفرت کی زبان نہیں آتی تھی

سب لوگ بصیرت رکھتے تھے

سب لوگ محبت کرتے تھے

عرفان بیگ تبدیلی کے خواہاں ضرور ہیں مگر یہ تبدیلی دست بازو کی منت کش نہیں۔ ''میرا شہر مجھے واپس کر دو'' میں وہ ماضی کی طرف بار بار پلٹ کر ان کھوئی ہوئی یادوں کی جستجو کرتے ہیں کہ جس سے حال میں بھی تازگی آئے۔ اس نظم میں وہ ایک ایسے شہر کو دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں خوشبوؤں کا ڈیرہ تھا۔ جہاں نسل اور مذہب کے درمیان کوئی تفریق نہیں تھی۔ لوگ عشق و محبت کرتے۔ مگر اب وہ شہر روئے زمین پر نہیں رہا۔ ہر طرف بم دھماکے، کشت و خون، بے وفائی اور حرص و لالچ نے شہروں کی رونقیں چھین لی ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر اور کیا دکھ ہوگا کہ اک شاعر کو اپنی بستی میں بھی محبت نہ ملے۔

عرفان بیگ جیسا شاعر ایک بے اماں بستی میں لوٹ آیا ہے۔ جہاں لوگ ضرورت کے بھنور میں ناچتے ہیں اور اپنی ضرورت کی خاطر جبر و تشدد پر اتر آئے ہیں وہ اپنی نظم ''بے اماں بستی'' میں لکھتے ہیں:۔

میں کیسی بے اماں، بے رحم سی بستی میں آیا ہوں

کہ جس میں لوگ کہتے ہیں

ضرورت کے بھنور میں ناچتے وحشی ترانوں پر

دلوں کی دھڑکنوں کو بے ردھم کرنا

سمجھ میں جو نہ آئے غم

تو دل میں اس کا غم کرنا

بھلا کر زندہ چہروں کو

کہیں تصویر تھرکانا۔۔۔۔۔۔

Draft

عرفانؔ صاحب ایسی بے اماں بستی کا متلاشی نہیں ہے۔ اس لیے وہ خوابوں کا سہارا لے کر اک ایسی بستی تک پہنچ جاتے ہیں کہ جہاں سب پھول بدن پھرتے ہیں۔ اس بستی کے لوگوں کی روحوں میں تبسم خوشبو کی ہے۔ ان کے سانسوں میں خدا کا لمس ہے۔ جن کے چہروں پر سچی مسکراہٹیں ہیں اور وہ سچے من سے محبت کرتے ہیں۔

عرفانؔ بیگ ایک نئی شعری روایت کے امین ہیں۔ وہ اپنی شاعری کی مجموعی فضا شہر کی بے مصرف زندگی سے لیتے ہیں۔ انکی نظم ''دھواں'' بہت سے تلخ رازوں سے پردہ اٹھاتی ہے۔ یہ نظم عصر حاضر کی بہترین اور نمائندہ نظم کہی جا سکتی ہے جس میں عرفانؔ بیگ دھوئیں کی علامتوں سے قاری کے سامنے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ نظم ''دھواں'' کے چند بند ملاحظہ ہو:۔

دھوئیں کو سوچنا ہوگا، دھوئیں کو دیکھنا ہوگا

دھواں لمحے کی ایک تصویر کا مبہم رنگ معنی ہے

دھواں لہجہ کسی تاریخ کے گدلے زمانوں کا

مکانوں، کارخانوں کا

،،،،،،،،،،،،،،،،دھواں وہ بھی دھواں

جو ایشیاء لاطینی امریکہ پہ پھیلا جا رہا ہے

اور گہری دھند بن کر، روشنی کو مارتا، آنکھوں کو جھلساتا

تمدن نام رکھ کر بولتا تاریک لہجے میں

کسی خونی زبان کے سارے وحشی لفظ لے کر

نفرتیں لکھتا، محبت قتل کرتا، عشق کو برباد کرتا

رقص کرتا، نوچتا جسموں کو، ہڈیوں کو کھا رہا ہے

دھوئیں کو سوچنا ہوگا

دھوئیں کو سوچنا ہوگا، دھوئیں کو دیکھنا ہوگا

عرفانؔ احمد بیگ کی علامتیں اور تشبیہیں اپنی ایجاد کردہ ہیں۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر

Draft

جانتے ہیں کرایہ داروں کی مشکلات کو تیسری دنیا کے ہجرتوں کے تناظر میں پیش کرنا ہو یا نظم "لمس کی آہٹ" میں زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا ہو۔ایک گھٹا ٹوپ سی تاریک سی کھائی اور اس میں گرتے صدیوں سے رواں نسلیں اور ہر طرف چاہی ہوئی دھند اور دھواں ہو وہ انہیں بہترین شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔مگر یہ دھواں اور دھند انھیں قنوطیت کی طرف مائل نہیں کرتا بلکہ انھیں رجائیت پرستی اور امید کی کیفیت میں لے جاتا ہے۔اس لیے وہ نظم "لمس کی آہٹ" میں امید پرستی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

عام طور پر جدید نظموں کا تعلق ابہام اور علائم سے جوڑا جاتا ہے۔مگر عرفانؔ بیگ کا لہجہ شائستہ، مہذب اور متوازن ہے۔انکے ہاں علامتیں تو ملتی ہیں مگر وہ اتنی مبہم نہیں ہوتیں کہ جنھیں قاری بغیر کسی وسیلے کے سمجھ نہ سکے۔ان کی نظموں میں گھن گھرج اور شور نہیں ملتا۔ان کی نظمیں فکری شعور سے بھرپور ہیں۔دھیمے لہجے کے عرفانؔ کی شاعری بھی دھیمی ہے۔وہ مزاحمت سے ہٹ کر فکر کی راہیں ڈھونڈتے ہیں۔نظم "ناخدا اور خدا خاموش کیوں؟" جیسی نظموں میں وہ دنیا میں استحصال کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔جبکہ نظم "محبت کی روح" میں وہ محبت کی روح سے ہمکلام ہو کر لوگوں کو محبت کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔وہ محبت کے مسائل کو سوچتے سوچتے ابن آدم کے دکھوں کے مسائل تک دسترس حاصل کر لیتے ہیں۔اور ان دکھوں اور مسائل کا حل بھی سوچنے لگتے ہیں۔کیونکہ یہ محبت ہی ہوتی ہے جو انھیں جسم و جاں کی قربتوں سے دور لے جا کر روح تک پہنچا دیتی ہے اور اُس لمس اور اُسکی آہٹوں تک رسائی دیتی ہے۔جہاں انسان اپنی ذات کے پردوں کو ہٹا کر ابن آدم کے مسائل پر بھی نظر کرنا شروع کر دیتا ہے۔

مجموعی طور پر عرفانؔ احمد بیگ نے اپنی شاعری میں فکر آگیں موضوعات کو کلاسیکی انداز سے برتا ہے۔ان کو سیاسی و سماجی موضوعات کو تغزل کا لبادہ اوڑھا کر قاری کے سامنے پیش کرنے کا فن آتا ہے۔ "لمس کی آہٹ" میں وہ عشق اور سماج کو ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔انکی شاعری داخلی اور خارجی حقائق کی بہترین تصویر کشی کرتی ہے۔عموماً وہ عشق و محبت کے درد کی داخلی کیفیات کو غزل کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور خارجی حقائق کو مدنظر رکھ کر انھیں خاص طور پر نظم کا موضوع بناتے ہیں۔ان کی نظمیں محض الفاظ کی نشت و برخاست کا نام نہیں ہیں بلکہ مشاہدے کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ لطافت اور فکر انگیز بھی ہے۔

Draft

ج:۔" لمس کی آہٹ " فنی جائزہ

شاعری حسین الفاظ کے امتزاج کا نام ہے ۔ یہ الفاظ معنی کے تابع ہوتے ہیں اور ان الفاظ کو سلیقے سے برتنے اور معنویت دینے کا نام ہی شاعری ہے۔ شاعری میں سلیقہ، معنویت اور تہہ داری اس وقت آجاتی ہے جب کوئی شاعر شعر موزوں کرتے وقت ان مروجہ اصولوں کی پابندی کرے جو علم بیان، علم بدیع اور علم عروض کے دائرے میں آتی ہیں۔اور یہی شاعری کا فن ہوتا ہے۔اور اس فن کو ناپنے، پرکھنے اور جانچنے کے لیے پیمانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم عروض، علم بیان اور علم بدیع یہ وہ پیمانے ہیں کہ جن کے ذریعے شعر کا معیار متعین کیا جا سکتا ہے۔ایک ناقد اور تبصرہ نگار انہی پیمانوں کو مد نظر رکھ کر کسی فن پارے کا جائزہ لیتا ہے۔مگر یہ ضروری نہیں وہ ناقد یا تبصرہ نگار جس طرح سے وہ پیمانہ استعمال کرے وہ سب کے لیے قابل قبول بھی ہو۔

شاعری ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق انسانی جذبات اور خیالات سے ہے۔شاعر اپنے خیالات کو بیان کرنے کے لیے مختلف راہیں چنتا ہے۔اور ان گنجلک اور مبہم راہوں میں سے اپنے فکر کی جولانیاں وضع کرتا چلا جاتا ہے۔ شاعری کا ایک منصب کسی خیال کو شعر کی صورت میں ڈھال کر پیش کرنا ہوتا ہے۔مگر اس صورت کے لیے بھی ایک قاعدہ لازمی ہے اور اس قاعدے کا نام علم عروض ہے۔جس میں شعر کی ظاہری ہیئت یعنی الفاظ کی ترتیب و توازن میں ہونا، مروجہ بحور و اوزان کی پابندی کرنا یہ سب شامل ہے۔ علم عروض جسے وزن جانچنے کا علم اور شاعری کا ڈھانچہ بھی کہا جاتا ہے اور اس کے ذریعے شعر کی موزونیت اور خیال کو بھی جانچا جاتا ہے۔ علم عروض کے لیے سب سے پہلی شرط شعر کا وزن پہ ہونا یعنی مروجہ بحر کی پابندی کرنا لازمی ہوتا ہے۔شعر کا وزن پہ ہونا اس لیے بھی ضروی خیال کیا جاتا ہے کہ آہنگ اور ترنم کا ایک ضابطہ میں ہونا وزن ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔جبکہ کسی معنی کو مختلف طریقوں سے بیان کرنے کا نام علم بیان ہے۔کوئی شاعر خیال کا اظہار مختلف رنگوں اور انداز سے کرتا ہے۔مناسب الفاظ کا استعمال، تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ کا استعمال جب شعر میں کرتا ہے تو وہ سب علم بیان کے دائرے میں آجاتے ہیں۔جبکہ علم بدیع کا

Draft

مقصد کلام میں لفظی اور معنوی حسن پیدا کرنا ہے یعنی یہ علم صنائع بدائع پر بحث کرتا ہے۔ جس کی دو قسمیں ہیں ایک صنائع معنوی جس میں معنوی سطح پر شعر میں خوبیاں آجائیں۔ اور دوسری صنائع لفظی ہے جس سے شعر کی ظاہری صورت آرائش پائے۔ فن کے انہی صورتوں کو مد نظر رکھ کر عرفانؔ احمد بیگ کی شاعری کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔

عرفانؔ احمد بیگ کے کلام میں تمام شعری محاسن موجود ہیں۔ وزن کی پابندی سے لے کر خیالات کی بندشوں تک انکے کلام میں کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا۔" لمس کی آہٹ "میں وہ غزل کے اشعار کی تعداد کے حوالے سے تجربے کرتے نظر آتے ہیں۔ عموماً غزل طاق اشعار کی صورتوں میں لکھی جاتی ہے۔ یعنی غزل، تین، پانچ، سات یا نو اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ مگر زیادہ تر پانچ یا سات اشعار کی غزلیں مستعمل ہیں۔ کچھ اساتذہ کے ہاں گیارہ اشعار سے اوپر کی بھی غزلیں ملتی ہیں مگر وہ غزلیں بھی طاق اشعار پر ہی مشتمل ہوتی ہیں۔ عرفانؔ بیگ کے ہاں غزل کے اشعار کی تعداد متعین نہیں ہے۔ یعنی وہ مروجہ اصولوں سے کبھی کبھی انحراف بھی کر جاتے ہیں۔" لمس کی آہٹ " میں طاق اور جفت اشعار پر مشتمل غزلیں ملتی ہیں۔" لمس کی آہٹ " میں تین اشعار کی ۵ غزلیں، چار اشعار کی ۴ غزلیں، پانچ اشعار کی ۹ غزلیں۔ چھ اشعار کی ۱۰ غزلیں، سات اشعار کی ۱۴ غزلیں، آٹھ اشعار کی ۵ غزلیں، نو اشعار کی ۳ غزلیں، دس اشعار کی ایک غزل اور بارہ اشعار کی دو غزلیں شامل ہیں۔ عرفانؔ احمد بیگ کے کلام میں عروضی حوالے سے کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ مختلف بحروں کے استعمال کا ہنر وہی جانتا ہے جو عروض کی باریکیوں سے واقف ہو۔ عرفانؔ احمد بیگ اہل زبان ہیں۔ جہاں وہ زبان کے روزمرہ اور محاورات کی بندشوں سے واقف ہیں۔ وہیں وہ علم عروض سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری مروجہ بحور کے تمام اوزان کی پابندی کرتی ہے۔ ان کے ہاں مختلف بحروں کا اہتمام ملتا ہے۔ وہ طویل اور مختصر دونوں قسم کے بحور استعمال کرتے ہیں۔ وہ بحروں کے استعمال کا فن خوب جانتے ہیں چھوٹی بحر کی چند مثالیں دیکھیئے:

خوشبوؤں میں بکھر گئی آخر
ایک تتلی تھی ، مر گئی آخر

پھر کوئی ماہتاب یا مولا
غم کا خانہ خراب یا مولا

Draft

چھوٹی بحروں کے استعمال نے عرفانؔ احمد بیگ کی شاعری کو سہل ممتنع کے درجے پر فائز کیا ہے۔وہ چھوٹی بحروں میں بڑے سے بڑے مضامین کو آسانی سے باندھتے ہیں۔انہوں نے طویل بحروں میں طبع آزمائی کی ہے۔انکی طویل بحروں کی چند مثالیں درج ہیں۔

وہ وصال ، ہجر کی مستیاں کہ وہ بات بات پہ چونکنا
تری عادتیں بھی گزر گئیں میری عادتیں بھی گزر گئیں

وہ کیا یقین تھے جو وسوسوں کے ساتھ رہے
عجیب موڑ تھے جو راستوں کے ساتھ رہے

عرفانؔ احمد بیگ کے کلام میں طویل بحروں کے استعمال کے باوجود غزل کا حسن ماند نہیں ہوتا۔وہ الفاظ کے استعمال کا ہنر جانتے ہیں۔اور بڑی بحروں کے استعمال کی وجہ سے انکی شاعری میں موسیقیت اور ترنم بہت زیادہ ہے۔ موسیقیت کی چند مثالیں پیش ہیں:

تیرے ہجر کے سناٹوں میں دور تلک آکاش تلے
درد اکیلا ساتھی اپنا اور سہیلی تنہائی

شہر کی بھیڑ میں لوگ اکیلے خالی خالی میلے
جیون سوچ کا گورکھ دھندہ اور پہیلی تنہائی

مندرجہ بالا اشعار میں قافیہ اور ردیف کی ہم آہنگی نے ایک خاص موسیقیت پیدا کی ہیں۔
حرف (ا) کے تکرار سے ترنم پیدا کرنے کا فن ملاحظہ ہو۔

Draft

رنگ آہٹ کہ صبا یاد نہیں
دل کو اب کوئی فضا یاد نہیں

ایک گھر تھا انہی گلیوں میں کہیں
ڈھونڈتا ہوں کہ پتا یاد نہیں

مندرجہ بالا صورتوں میں لفظ (ا) کے استعمال نے اشعار میں موسیقیت اور ترنم بھر دی ہے۔اسی طرح تکرار لفظی کے بہت سے خوبصورت مرقعے انکے کلام میں ملتے ہیں۔مثلاً ' ہڈی ہڈی، رگ رگ، کس کس نے، جسم جسم، لفظ لفظ، بستی بستی، گھر گھر، بڑھتے بڑھتے، پہلی پہلی، وحشت وحشت وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ کے تکرار نے انکے ہاں موسیقیت کو اور بھی نکھارا ہے۔

عرفان احمد بیگ کی شاعری میں موسیقیت اور ترنم کی وجہ انکا موسیقی سے لگاؤ بھی ہے۔کیونکہ وہ موسیقی کے اسرار و رموز سے بھی واقف ہیں بینجو، موتھ آرگن، بانسری بجانا وہ جانتے ہیں اور یہ آج بھی ان کی زندگی کا حصّہ ہے۔

قافیہ غزل کا حسن کہلاتا ہے۔یہ بات درست ہے کہ جدید نظم کے پیش روؤں نے قافیہ کو کئی لحاظ سے مورد الزام ٹھہرایا۔مثلاً قافیہ خیال کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔شاعر کے فکر و تخیل اور اظہار پر پابندی عائد کرتا ہے۔یہ سارے الزامات اپنی جگہ مگر قافیہ کی خوبصورتی اپنی جگہ مسلم ہے۔اور قافیہ غزل کے اشعار کو بے مہار ہونے سے بچاتا ہے۔ان میں توازن پیدا کرتا ہے اور ایک خاص آہنگ کا باعث بنتا ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''غزل کا ہر شعر بچے کی طرح ماں کی انگلی تھامے ہوتا ہے کہ
> اچانک وہ ماں سے ہاتھ چھڑا کر کسی نئی شے کو دیکھنے کے لیے لپکتا ہے مگر پھر
> بھرے میلے میں گم ہو جانے کے ڈر سے دوڑ کر دوبارہ ماں کی انگلی
> (قافیہ اور ردیف) کو تھام لیتا ہے۔''(۹)

عرفان احمد بیگ قافیہ اور ردیف کے انتخاب پر خاص توجہ دیتے ہیں۔وہ اس امر سے بھی آگاہ ہیں کہ

Draft

موسیقیت کا تعلق غزل کے قافیہ اور ردیف سے ہے۔ اس لیے قافیہ اور ردیف کی صوتی تکرار کی وجہ سے انکے کلام میں موسیقیت اور صوتی آہنگ پیدا ہوجاتا ہے۔ اور وہ قوافی کو اس طرح اشعار میں موزوں کرتے ہیں کہ شعر قافیہ بندی نہیں لگتا۔ مثلاً

ان کھڑے پانیوں کی بو جائے
کوئی سورج زمین کو چھو جائے

عرفان احمد بیگ کے کلام میں روایتی اور زیادہ مستعمل قافیے ملتے ہیں۔ مثلاً ثانی، معنی، خامشی، وابستگی، جام، نام، بو، چھو، گز، کدھر، ذرات، اثرات، جگالیں، مسکرالیں، دلدل، چھاگل، چاک، ادراک وغیرہ وغیرہ۔ مگر انکے کلام میں ایسے قافیہ بھی ملتے ہیں جو زیادہ مستعمل نہیں ہیں۔ مثلاً تلملاہٹ، جھلملاہٹ، سرسراہٹ، چبوتروں، کدورتوں، روایتوں، انگڑائی پہنائی، دانائی بینائی وغیرہ وغیرہ۔ قافیہ کی طرح ردیف بھی کلام کا لازمی جزو شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ردیف کی تکرار سے شعر میں موسیقیت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ عرفان احمد بیگ کے ہاں مردّف اور غیر مردّف غزلیں بھی پائی جاتی ہیں۔ انکے مجموعہ کلام "لمس کی آہٹ" میں دو غیر مردّف اور ۵۲ مردّف غزلیں موجود ہیں۔ "لمس کی آہٹ" میں اُردو کے مستعمل ردائف ملتے ہیں۔ مثلاً 'کی طرح، ساتھ تھے، کی ہے، جارہا ہے، رہ جاتا وغیرہ وغیرہ۔ مگر انکے کلام میں ایسی ردیفیں بھی موجود ہے۔ جنھیں مشکل ردیفیں کہہ سکتے ہیں جو اُردو میں زیادہ مستعمل نہیں ہیں۔ مثلاً تنہائی، آنکھیں، دھند، لڑکی، یا مولا، فرض کریں وغیرہ وغیرہ۔

عرفان بیگ کے کلام میں مختصر اور قدرے طویل ردیفیں بھی ملتی ہیں ان کی مختصر ردیفوں میں، بولے' کی طرح، بدل گئے، سی تھی، ہیں، آنکھیں، جائے، آخر، کھلے، رہ گئے وغیرہ وغیرہ شامل ہیں، چھوٹی ردیف کی مثال دیکھیں:

دھوپ کے دھبے کوڑھ کی صورت
کاریزوں کا پانی بولے

اسی طرح قدرے طویل ردائف مثلاً۔ بھی دے دیتا، سے بھی واقف ہوں، میں رہتا ہوں نہیں دیکھا جاتا تھا میں

Draft

نے ،چھن جائے گی، کا ابہام رہا' وغیرہ وغیرہ بھی انکے کلام میں موجود ہیں۔قدرے طویل ردیفوں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

شکست و ریخت میں اسباب سے بھی واقف ہوں
وہ ساز ہوں کہ میں مضراب سے بھی واقف ہوں

مجھ سے آسیب زدہ گھر نہیں دیکھا جاتا
اب تری ذات کے اندر نہیں دیکھا جاتا

عرفانؔ احمد بیگ کی شاعری میں کم وبیش تمام صنائع شعری ملتے ہیں۔انکے کلام میں علم بیان اور علم بدیع اپنی خوبصورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔علم بیان اور علم بدیع کے استعمال نے انکے کلام میں خوبصورتی پیدا کر دی ہے جسکی وجہ سے انکی شاعری ایک نئی جہت اور نئے اسلوب کی نمائندہ بن چکی ہے اس حوالے سے مزمل حسین لکھتے ہیں:

Draft

”علم بیان ایسی صلاحیت کا نام ہے جو شعر و ادب میں معنی کی مختلف جہات کو اجاگر کرتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ ”بیان“ ایسے علم کو کہتے ہیں جو تخلیق کار کو کلام میں موزوں الفاظ کے استعمال اور اظہار مطلب کے مختلف اسلوب پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔اور اس کے انداز بیان کو موثر اور دل نشین بناتا ہے تو زیادہ صحیح اور مناسب ہوگا۔“(۱۰۔)

علم بیان کی کئی صورتیں ہیں مثلاً تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل وغیرہ وغیرہ۔یہ تمام صورتیں کلام میں حسن پیدا کرتی ہیں۔ان کے استعمال سے حسن آفرینی، معنی آفرینی اور اختصار کا کام لیا جاتا ہے جس سے شعر میں بلاغت کی خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔

عرفانؔ احمد بیگ کے کلام میں بھی تشبیہات اور استعارات کا استعمال ملتا ہے ۔انکے ہاں روایتی

تشبیہات اور استعارات بھی مستعمل ہیں۔ مگر انکے زیادہ تر تشبیہہ اور استعارے انکے ذہنی عمل کا نتیجہ اور اختراع ہے۔ تشبیہہ کے مثال ملاحظہ ہوں؛

اپنی گلیاں روایتوں کی طرح
لوگ ساکن چبوتروں کی طرح

اس شعر میں تشبیہہ بالکل ایک نئے انداز اور ڈھنگ میں استعمال کی گئی ہے۔ کہ جس میں لوگوں کی بے عمل اور ساکن زندگی کو چبوتروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی انکی گلیوں میں وہی روایات اب بھی باقی ہیں اور لوگ ساکن چبوتروں کی طرح ہیں جن میں زندگی کی کوئی حرکت باقی نہیں۔ مندرجہ بالا شعر استعارے کے ضمن میں بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ تشبیہہ کی اور مثالیں بھی ملاحظہ ہو:

بدن کوئی لچکتی شاخ جیسا
خوبانی گال اور بادام آنکھیں

سنجدی شاخوں کے جیسا سانولا روشن بدن
اور اس پر چاندنی میں جسم سے لپٹی ہوا

ان اشعار میں روایتی طرز پر محبوب کے حسن و جمال کو مختلف رنگ روپ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ یعنی مندرجہ بالا صورتوں میں عرفانؔ بیگ محبوب کے بدن کو سنجد کی سانولی اور لچکتی شاخ سے تشبیہہ دے کر غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہیں۔

تشبیہہ کی طرح عرفانؔ احمد بیگ کے کلام میں استعارے کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ استعارے کے استعمال سے کلام میں معنویت اور رمزیت آجاتی ہے۔ یعنی ایک لفظ کو حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال کرکے اس کی رمزیت اور معنویت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ عرفانؔ احمد بیگ کی شاعری میں استعارے کا خاص عمل دخل ہے۔ انکے استعارے اپنی ذات کے بھی ہے اور اس سماج کے بھی۔ ان کی

Draft

شاعری میں آئینہ، من مندر، دھواں، دھند اور تمازت جیسے استعارے استعمال ہوئے ہیں انکے ہاں استعارے کا استعمال دیکھیئے:

کہیں شبنم کرن کونپل حرارت
دھندلکا روشنی کی کوئی لکنت

خدا کی میٹھی پیاری گفتگو سی
کسی بچے کی روشن مسکراہٹ

عرفانؔ صاحب ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں اس لیے انکے ہاں استعارے زیادہ تر اسی نظریے کے تحت مستعمل ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر میں بھی اسی نظریے کی عکاسی نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وطن کے عشق میں بدعت نہیں کی
پرندے تھے مگر ہجرت نہیں کی

بعض جگہ عرفانؔ بیگ کے استعارے علامتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ عرفان کی شاعری میں کنایہ کا استعمال بھی ملتا ہے۔

اس مشاق سے بازی گر کا آخری کرتب تھا
رسے کے جب بیچ وہ پہنچا رسہ ٹوٹ گیا

اس شعر میں بازی گر سے مراد انسان بھی ہے اور کھیل تماشے کرنے والا بھی۔ "مشاق سے بازی گر" کی صورت میں بہترین کنایہ تخلیق کیا گیا ہے۔ عرفانؔ احمد بیگ کے ہاں تلمیحات کا بھی استعمال ہوا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تلمیحات کے استعمال کے بارے میں لکھتے ہیں:

Draft

"تلمیحات ماضی کی وہ روایات ہیں جن کے مطالب ہمارے سماجی اجتماعی حافظے میں اچھی طرح رچ بس گئے ہیں۔ الفاظ اور اصطلاحوں کی طرح یہ بھی زبان کا ضروری جزو ہیں۔ تلمیحات زیادہ تر دیومالا کے قصے کہانیوں، مذہبی، تاریخی اور نیم تاریخی واقعوں، لوک روایتوں اور رزمیوں یا کلاسیکی شعرا کی طویل نظموں یا قدیم ناٹکوں وغیرہ سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ان کی حیثیت رمز و اشارہ یا علامت کی سی ہے جن کی مدد سے ایک پورا واقعہ یا مکمل منظر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ اس لحاظ سے یہ بلاغت کی جان ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی ادا کرنے کی جیسی صلاحیت تلمیح میں ہے، الفاظ کی دیگر اقسام میں نہیں۔ ان کی یہ معنی خیزی ہمیں تکرار اور یکسانیت سے بچاتی ہے اور زبان و بیان کا لطف و اثر بڑھاتی ہے۔(۱۱)

عرفان احمد بیگ کے کلام میں کوئی روایتی طرز کی تلمیح نہیں ملتی۔ شاعری میں جس طرح اسلامی یا دیگر مذاہب کے قصوں کو تلمیحات کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے وہیں لوک روایتی قصے بھی بیان ہوتے ہیں۔ "لمس کی آہٹ" میں تلمیحات کا استعمال شاذ و نادر ہی کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں قصہ شہ مرید و حانی کو تلمیح کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ عرفان احمد بیگ کی یہ تلمیح انکے مقامی روایتوں کے ساتھ جڑے رہنے کا ثبوت بھی ہے۔

عرفان احمد بیگ کے کلام میں علم بدیع کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔ مزمل حسین لکھتے ہیں:

علم بدیع ایسا علم ہے جس سے کلام میں خوبیاں (لفظی و معنوی) پیدا کی جاتی ہے۔ لیکن یہ علم مقتضائے حال کے مطابق رہے اور پیچیدہ نہ بن جائے بلکہ کلام میں دل کشی اور اثر پیدا ہو، لیکن یہ وصف اسی وقت پیدا ہوگا جب کلام میں صنائع بدائع کا استعمال ایک حد تک رہے۔ اور ان کا بے جا استعمال کرنے سے گریز کیا جائے۔(۱۲)

Draft

عرفان احمد بیگ کے کلام میں صنائع بدائع کا استعمال بے جا معلوم نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کا استعمال شعر کے حسن وخوبی میں اضافے کے لیے کرتے ہیں۔انکے ہاں بعض جگہوں پر صنائع اپنی موجودگی کا اظہار کیے بغیر معنوی سطح پر پائے جاتے ہیں۔جن سے ان کے اشعار کی معنویت اور حسن ولطافت میں اضافہ ہوتا ہے۔انکے کلام میں صنعت جمع،صنعت تکرار،صنعت ایہام،صنعت تضاد،صنعت لف ونشر خاص طور پر استعمال ہوا ہے۔صنعت تضاد کا استعمال دیکھیئے۔

دہری سوچیں ذہن جلائیں
دشمن بولے جانی بولے

اس شعر میں صنعت تضاد کی صورت لفظی ہے۔اسی طرح صنعت ایہام کا استعمال دیکھیئے۔

چھپ کے جائے تو چھپ کے جا نہ سکے
جانا چاہے تو دو بدو جائے

اسی طرح عرفان احمد بیگ کے کلام میں باقی صنائع بھی استعمال ہوئے ہیں۔خصوصاً ان کے اشعار میں الفاظ کی بار بار تکرار صنعت تکرار کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔جبکہ بعض جگہوں پر وہ الفاظ کو صنعت جمع کی صورت میں بھی استعمال کرتے ہیں۔بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم بیان اور علم بدیع کے استعمال نے انکے کلام میں خوبصورتی پیدا کر دی ہے جسکی وجہ سے ان کی شاعری ایک نئی جہت اور نئے اسلوب کی نمائندہ بن چکی ہے۔

عرفان احمد بیگ کے کلام کی ایک اہم خوبی ان کا علامتی رنگ ہے۔جسے وہ غزل اور نظم دونوں میں بھرپور شاعرانہ وصف کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔انکی علامتیں نئے دور کی ترجمان ہیں۔وہ علامتوں کا استعمال محض شعر کی خارجی پیکر اور حسن کے لیے نہیں کرتے۔بلکہ ان علامتوں کا استعمال وہ سماجی مسائل،انسانی کمزوریوں،منفی رویوں،جیسے مسائل کو بیان کرنے کے لیے کرتے ہیں۔نظم ''دھواں'' ان کی ایک اہم علامتی نظم ہے۔جس میں وہ دھواں کی علامت استعمال کر کے پوری دنیا پر تہذیب اور تمدن کے غلبے کو دھوئیں کی صورت میں دکھاتے ہیں۔آخری چند مصرعے ملاحظہ ہو:۔

Draft

دھواں وہ بھی دھواں
جوموت بن کر آسمانوں کی گھپاؤں سے
بھیانک راستوں والے خلاؤں سے
مری دنیا کی جانب آنے والا ہے
اگراب یہ دھواں آیا،تو پھر سب کچھ دھواں ہوگا
بدن، لہجے، محبت، دوستی
چہروا ہوں ہنسی
غرض سب کچھ دھواں ہوگا
مگر سب کچھ دھواں ہونے سے پہلے سوچنا ہوگا
دھوئیں کو سوچنا ہوگا، دھوئیں کو دیکھنا ہوگا

Draft

اس طرح وہ غزل میں بھی علامتوں کا استعمال کرتے ہیں۔دھواں، لمس اور آئینہ عرفان احمد بیگ کی خاص علامتوں میں سے ہیں۔ جنھیں وہ کم وبیش کسی نہ کسی غزل یا نظم میں ضرور استعمال کرتے ہیں۔نظم ''نئی ہجرتیں' خوشبو، لمس کی آہٹ اور''خوشبو، پھول، پرندے، بچے''ان کے خاص علامتی نظموں میں شامل ہیں۔

عرفانؔ احمد بیگ کا اسلوب سادہ اور ابہام سے پاک ہے۔انکی شاعری دھیمے لہجے کی شاعری ہے۔اور یہ لہجہ یکبارگی ذہن پر وار نہیں کرتا بلکہ آہستہ آہستہ ذہن کو جھلسا دیتا ہے اور دل کو پگھلا دیتا ہے۔انکے کلام میں مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی معنوی تہہ داری بن کر سامنے آتی ہے۔ جہاں عرفانؔ احمد بیگ کے ہاں غزل اپنی تمام تر موضوعات کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔وہیں انکے ہاں پابند اور مسلسل غزل کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔جن میں موضوع اپنے مفہوم کے حوالے سے تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اور یہی تسلسل انکی نظموں میں بھی برقرار ہے۔ان کی نظموں میں خارجی پیکر سے لے کر داخلی مفہوم تک موضوع ایک ہی تسلسل میں ہے۔عرفانؔ بیگ کے اسلوب کی یہی خوبی ہے کہ قاری مبہم الفاظ کے جال میں پھنسنے کی بجائے سیدھے سادے انداز میں بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔انکے کلام میں حسن وعشق کے ساتھ

سیاسی وسماجی موضوعات بھی سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔

عرفان بیگ کی ذات کی طرح انکی شاعری میں بھی سلیقہ ہے۔ وہ الفاظ کا چناؤ اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ مفہوم کے ساتھ ساتھ قاری الفاظ کی بندشوں کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ وہ الفاظ کو گن گن کر اور تول تول کر توازن سے شعری پیکر میں ڈھال لیتے ہیں۔ اس لیے ان کی غزل ایجاز و اختصار کا نمونہ بن گیا ہے۔ مگر ایجاز و اختصار سے بھرپور انکی شاعری سادگی اور سلاست کے باوجود اپنے اندر ایک جہان معنی سمیٹی ہوئی ہے۔ مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں۔

اپنے قد سے چھوٹا بن کر مدت سے
پاؤں سکیڑ اک چادر میں رہتا ہوں

ہڈی ہڈی گھنٹی بن کر بجتی ہے
تھک جاتا ہوں من مندر میں رہتا ہوں

Draft

عرفان صاحب کے کلام میں تراکیب کے ساتھ ساتھ مرکب الفاظ کا ایک ایسا ذخیرہ موجود ہے جو قاری کو ایک جہانِ حیرت میں پہنچا دیتا ہے۔ انکے ہاں تراکیب عموماً دو لفظی ہیں مثلاً نفسِ جاں، نقشِ پا، مشامِ جاں، ظرفِ دل وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ انکے کلام کی خوبصورتی انکے مرکب الفاظ میں ہے۔ جن سے انکے ہاں امیجری کی صورت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً 'ہاتھ کا لمس، سانکن چبوتریں، خون کے سالار، آواز کا نشہ، آنچلوں کی دھنک، کرچی لمحے، قرب کا زخمی موسم، تعبیروں کی آہٹ، غم کی لے، تجریدی جذبے، آہٹوں کے لہجے، یاد کی پائل، دھوپ کے دھبے، شام کا لہجہ، نظر کا لمس، خوف سے پاگل شاخیں، کرنوں کی چیخیں، آنسوؤں کا لہجہ، سانکن کھڑکی، ہڈی ہڈی گھنٹی بننا، لمس کی آہٹیں، ابہام زدہ دھند، نیند نگر کی سرحد، شہر بدر سی آنکھیں، من مندر، نظر کی روشنائی سے روح پر لکھنا اور روشنی کی لکنت جیسے کئی الفاظ ملتے ہیں جو اتنے کومل اور شیریں ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور قاری انکے سحر میں کھو جاتا ہے۔ کچھ الفاظ تو ایسے بھی ہیں جنھیں عرفان احمد بیگ بار بار استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً لمس، آئینہ، دھواں، نظر، یاد جیسے الفاظ کی بار بار تکرار سے انکے ہاں نئے شعری امیجری اور علامتیں آگئی ہیں جو خاص انہی کا وصف ہے۔ اور یہی مرکب الفاظ انھیں انفرادیت بخشتے ہیں۔ پاکستان بالخصوص بلوچستان کی شعری فضا پر وہ

ایک ایسی منفرد آواز ہے جو اپنی ایک مخصوص رنگ و آہنگ رکھتے ہیں۔ وہ آدھی سانس میں پوری بات کہنے کا فن جانتے ہیں۔ اس بارے میں فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں کہ:۔

> ''ہمارے نسل کے لوگوں کو ہی نہیں، نوجوان شعراء کو بھی، جن کے سامنے تر و تازہ تنفس کا بڑا خزانہ موجود ہے۔ پوری بات کہنے کا فن عرفان بیگ جیسے شعراء سے سیکھنا چاہیے''(۱۳۔)

عرفانؔ احمد بیگ کی شاعری کا مزاج خالص اردوئی ہے۔ یعنی انکے کلام میں نہ بلوچستانی اردو کی کوئی جھلک ملتی ہے اور نہ ہی ہندی و فارسی کے اثرات موجود ہیں۔ یعنی جس طرح بلوچستان کے دوسرے ادیبوں کے ہاں بلوچستان کی مقامی اُردو کے الفاظ جیسے کوچرا، ڈبل ڈبل کرنا وغیرہ وغیرہ شامل ہیں انکے ہاں یہ الفاظ نہیں ملتے۔ اور نہ ہی ان کے کلام میں ٹھیٹھ ہندی یا فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مگر ہندی اور فارسی کے وہ الفاظ جو اب اُردو کا حصّہ بن چکے ہیں۔ جیسے پیار، چتا، گھور، گھپا، چھاگل، آکاش وغیرہ وغیرہ وہ ضرور انکے کلام میں موجود ہیں مگر انھیں ہندی زدہ یا فارسیت نہیں کہا جا سکتا۔

عرفانؔ احمد بیگ چونکہ اہل زبان ہیں اس لیے انکے کلام میں محاورات بھی موجود ہیں۔ انکے ہاں اُردو کے وہ محاورات جو اہل زبان بطور روزمرہ استعمال کرتے ہیں موجود ہیں۔ مثلاً' سبق پڑھانا، آئینہ دکھانا، چونک اٹھنا، سکتے میں ہونا، قہقہہ لگانا، لطف اٹھانا وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے ان کا کلام خالص اُردوئی کہا جا سکتا ہے۔ البتہ وہ اپنے کلام میں کہیں کہیں بلوچستانی فضا کو اشعار کی صورت میں ڈھال لیتے ہیں۔ مثلاً انکے کلام میں بلوچی لفظ نود (چاند کے سامنے ہلکے بادل) کا استعمال ملتا ہے یا خوبانی گال، بادام آنکھیں، سنجد جیسی سانولا روشن بدن جیسے الفاظ خالص بلوچستانی فضا کو آشکار کرتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی کہہ سکتے ہیں کہ ''لمس کی آہٹ'' ایک زندہ شعری پیکر ہے۔ یہ مجموعہ عرفانؔ احمد بیگ کی ایسی اختراعی کاوش ہے کہ جس میں انہوں نے مختلف موضوعات کو برتنے کے باوجود شعری آہنگ، امیجری، غنائیت اور لطافت کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ بلوچستان کی شعری فضا میں عرفانؔ احمد بیگ ایک ایسی آواز کا نمائندہ ہے جس کی گونج ان برف پوش پہاڑوں سے نکل کر دور آفاق میں سنائی دیتی ہے۔ انکا یہ جدید اسلوب فکر کی جولانیاں وضع کرتے ہوئے شعری لطافتوں کو نہیں بھولتا بلکہ دریا کہ دونوں پاٹ کی طرح ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

Draft

حوالہ جات

۱) عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر ، "لمس کی آہٹ"، دیباچہ ، محمود شام ، ص۔ ۱۲

۲) ایضاً ، --سرورق ، حارث خلیق

۳) طارق ہاشمی ، "اُردو غزل - نئی تشکیل"، ص۔ ۲۰

۴) ایضاً ،---------------------- ص ۔۱۴۔۱۵

۵) اشرف کمال،ڈاکٹر، "تاریخ اصناف نظم ونثر"، ص۔۷۲

۶) فاروق احمد ،ڈاکٹر، "بلوچستان میں اُردو شعر و ادب" ص۔۱۰۸

۷) ایضاً،----------------------------------ص۔۱۰۹

۸) عرفان احمد بیگ،ڈاکٹر،"لمس کی آہٹ" پس ورق،فہمیدہ ریاض

۹) مرتبہ محمد الیاس کبیر، "جدید اردو شاعری (روایت سے بغاوت تک)"ص۔۲۰

۱۰) مزمل حسین،"اردو میں علم بیان اور علم بدیع کے مباحث: تحقیقی وتنقیدی جائزہ"ص۔۱۱

۱۱) گوپی چند نارنگ، " اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب" ص۔۲۹۷۔۲۹۸

۱۲) مزمل حسین،"اردو میں علم بیان اور علم بدیع کے مباحث: تحقیقی وتنقیدی جائزہ"ص۔ ۱۳

۱۳) عرفان احمد بیگ،ڈاکٹر،"لمس کی آہٹ" پس ورق،فہمیدہ ریاض

Draft

باب سوئم:۔ ڈاکٹر عرفانؔ احمد بیگ کی افسانوی خدمات

ا:۔ ”گتے کے پہلوان“ تعارف و جائزہ:۔

ب:۔ ”گتے کے پہلوان“ فکری جائزہ:۔

Draft

ج:۔ ”گتے کے پہلوان“ فنی جائزہ:۔

کردار نگاری۔ مکالمہ نگاری۔ منظر نگاری۔ پلاٹ۔ وحدت تاثر۔ تجسس و جستجو۔ اسلوب نگارش

☆۔ حوالہ جات

ا:۔ ''گتے کے پہلوان'' تعارف وجائزہ:۔

پروفیسر ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے ۱۹۷۰ء سے افسانہ نگاری شروع کی۔افسانہ نگاری میں خادم مرزا اور پروفیسر مجتبیٰ حسین سے رہنمائی حاصل کی۔ان کے افسانے روزنامہ جنگ کوئٹہ، مشرق کوئٹہ، سہ ماہی قلم قبیلہ کوئٹہ اور ماہ نو لاہور جیسے مؤقر ادبی رسالوں، اخبارات اور ادبی جریدوں میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''گتے کے پہلوان'' کے نام سے یکم اگست ۲۰۰۱ء کو الحمد پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔''گتے کے پہلوان'' کا انتساب ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے اپنے والد مرحوم حنان احمد بیگ کے نام کیا ہے۔

''گتے کے پہلوان'' کا دیباچہ پروفیسر ڈاکٹر فردوس انور قاضی نے تحریر کیا ہے۔ دیباچے میں انہوں نے عرفان احمد بیگ کے فن اور شخصیت دونوں پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔اور چند ایک افسانوں کا فنی وفکری تجزیہ بھی کیا ہے۔اس بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ:

> '' عرفان احمد بیگ نے زندگی کو جتنی جہتوں کے ساتھ جیا ہے۔زندگی کو دیکھنے، محسوس کرنے، اور چکھنے کے جتنے مواقع عرفان بیگ کو ملے اس کے تحت امید کی جا سکتی ہے کہ افسانوں کا مجموعہ ''گتے کے پہلوان'' فن افسانہ نگاری میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگا۔'' (۱۔)

دیباچے میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی نے عرفان بیگ کے افسانوں ''ببول، گتے کے پہلوان، کوکلا چھپاکی، مشرق، چوتھا زاویہ، کبڑے مسافر، انعطاف نظر اور انصاف سے پہلے'' کا مختصراً فنی وفکری جائزہ لے کر عرفان بیگ کے فن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک اہم افسانہ نگار کے عنوان سے ڈاکٹر فاروق احمد کا مضمون بھی شامل کتاب ہے۔''گتے کے پہلوان'' کے

Draft

بارے میں ڈاکٹر فاروق احمد لکھتے ہیں:۔

"عالمی، سیاسی، معاشی شعبدہ بازوں کی بے اماں شورش کے
باعث تیسری دنیا کا آدمی بالخصوص "گنتے کا پہلوان" بن کر رہ گیا ہے ۔ گنتے کے
پہلوانوں پر لکھی ہوئی درد کی تحریر بظاہر پڑھی نہیں جاتی۔ لیکن
عرفان احمد بیگ محدب عدسے سے ان تحریروں کو پڑھ بھی رہے ہیں
اور پوری دیانت سے ہمیں سنا بھی رہے ہیں۔"(۲)

زیر بحث مضمون میں ڈاکٹر فاروق احمد نے عرفان بیگ کے افسانوں، "ببول، مشرق، گھنٹہ گھر، کبڑے مسافر" کا فنی و فکری جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کے رجحانات اور ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کے فن کو قاری کے سامنے اجاگر کیا ہے۔

"علامت نگاری اور عرفان احمد بیگ" کے عنوان سے جوہر میر نے مضمون لکھ کر عرفان بیگ کے فن پر تبصرہ تحریر کیا ہے۔ زیر بحث مضمون میں جوہر میر نے علامت نگاری کے فن اور عرفان بیگ کے ہاں علامتوں کے استعمال کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے جوہر میر لکھتے ہے۔

"عرفان احمد بیگ کے افسانوں کا مجموعہ "گنتے کے پہلوان"
دراصل علامت نگاری کے اسی تجربے کا مرہون منت ہے جو کسی کہانی کے
خاتمے کے ساتھ "ہمارا تمھارا خدا بادشاہ" کے الفاظ پر ختم نہیں ہو جاتا،
قاری کو افسانہ پڑھ چکنے کے بعد سوچنے کی دعوت دیتا ہے، اسے قابل فہم
علامتوں کی مدد سے اپنے گرد و پیش کو سمجھنے کا ادراک دیتا ہے۔"(۳)

"حیرانیوں کے سفر" کے عنوان سے ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کا اپنا تبصرہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ اس مضمون کو کتاب کا پیش لفظ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ عرفان احمد بیگ نے یہ انکشاف کیا ہے کہ عالمی سطح

Draft

سے گھر تک کی وہ تمام حیرانیاں، جو اقتصادی، نو آبادیاتی نظام، سائنسی تعلیم اور گلوبل ولیج کے نام سے پیدا ہو رہی ہیں انکے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے عرفان احمد بیگ کے ترقی پسندانہ سوچ کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

ب ”گتے کے پہلوان“ فکری جائزہ:

عرفان احمد بیگ ایک ترقی پسند سوچ کے حامل افسانہ نگار ہے۔ سماجی اور معاشی مسائل کو انہوں نے خاص طور پر افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ عرفان بیگ محبت اور حسن کے مسائل کو بھی معاشی حوالوں سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ ”گتے کے پہلوان“ کے افسانوں کا فکری حوالے سے تجزیہ کیا جائے تو یہ تمام افسانے تیسری دنیا کے انسان اور اسکے مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ عرفان بیگ کی کہانیاں تیسری دنیا کے قحط زدہ، جنگ زدہ و جنس زدہ اور تھکے ماندے انسانوں کی کہانیاں لگتی ہیں۔

ذیل میں عرفان احمد بیگ کے چند افسانوں کا فکری جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے ان کی فکری سمت واضح ہو جائے گی۔

”گتے کے پہلوان“ کا پہلا افسانہ ”مشرق“ ہے۔ یہ افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک اہم افسانہ ہے۔ عنوان ”مشرق“ پورے مشرقی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ اس افسانے میں مشرقی عورت اور مرد کی جنسی جذبات و احساسات کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ ”مشرق“ میں ایک لڑکی کی نازک ترین جذبوں، احساسات اور سیکس کے جمالیاتی پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔“(۴) ”شمیم“ نامی لڑکی زندگی کی جمالیاتی رخ سے واقف ہے۔ اور اس جمالیاتی رخ کو کھل کر محسوس کرنا چاہتی ہے مگر وہ مشرقی عورت ہے۔ مشرق نے عورت کو عزت تو بخشی مگر اس کی احساسات کو نظر انداز کر کے اسے ضرورت کی چیز ہی سمجھی۔ شمیم محبتوں اور رفاقتوں کے دو طرفہ تعلقات کی متلاشی ہے اور جب وہ رفاقتوں میں پہل کرنا چاہتی ہے تو اسے ہمیشہ دھتکار ملتی ہے۔

افسانہ ”مشرق“ میں حسن کو جمالیاتی کی بجائے افادی حیثیت دی گئی ہے۔ عرفان احمد بیگ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس نازک مسئلے کی نشاندہی کر کے عورتوں کے جمالیاتی احساس کو موضوع بنایا ہے جسے دانستہ طور پر نظر انداز کیا

Draft

جاتا ہے۔

"حسن کے لیے اس سے بڑا کوئی المیہ نہیں ہوگا کہ پھول اور تتلی
دونوں اندھے ہو جائیں۔"(۵۔)

بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن افادی نہیں بلکہ جمالیاتی ہے۔ مگر افسانے کا مرد کردار جاوید اسے افادی حیثیت سے جانتا ہے اور جاننا چاہتا ہے۔ اس لیے افسانے میں موضوع کے اعتبار سے حسن کو افادی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر فردوس انور قاضی:۔

"یہ افسانہ بظاہر ایک لڑکی کی نا آسودہ زندگی کی کہانی ہے لیکن
دراصل یہ کہانی اجتماعی زندگی کے اس رخ کو پیش کرتی ہے جس میں
رفاقت کے ادھورے زاویے عورت اور مرد دونوں کو ان خوشیوں سے محروم
رکھتے ہیں جو ذات کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔" (۶۔)

Draft

افسانہ "انعطاف نظر" میں انسانی فکر، سوچ اور زندگی کی متضاد رویے سے پیدا ہونے والی دکھوں کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انسان کی مثبت اور منفی سوچ کو نظر اور روشنی کی علامتی صورتوں میں ظاہر کیا گیا ہے یعنی نظر اور روشنی مشین کی گراریوں جیسی ہیں جنھیں غلط فٹ کرنے سے پوری مشین خراب ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح منفی سوچ سے نظر کی گراریاں متاثر ہو سکتی ہیں۔ نظر، روشنی اور گراریوں کی صورت میں انسانی زندگی کے رشتوں کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپسی تعلقات سے لے کر زندگی کے ہر معاملات میں بات صحیح فٹنگ کی ہوتی ہے تبھی زندگی میں توازن برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

افسانہ "گتے کے پہلوان" میں علامتی انداز میں پوری دنیا کو ایک گلوب کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ سوچ کا حامل افسانہ ہے جس میں دو بچے گتے کے پہلوانوں میں دھاگہ پرو کر انھیں آپس میں لڑا رہے ہیں اور ان بچوں کا باپ گلوب پر ہاتھ رکھ کر انہیں دیکھ رہا ہوتا ہے جس کی وجہ سے گلوب میں گڑھا پڑ جاتا ہے۔ "گتے کے پہلوان" ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کی علامت ہے جنھیں سپر طاقتیں اپنی مفادات کی خاطر آپس میں لڑا رہی ہیں۔ افسانے کا کردار جب گلوب گھماتا ہے تو پوری

دنیا ایک رنگ کی ہوجاتی ہے۔یعنی وہ سرحدیں وہ تفریقیں جنھیں انسانوں نے اپنی حفاظت کے نام پر بنائی ہیں ختم ہوجاتی ہے۔افسانے کی فکر سے واضح ہوتا ہے کہ پوری دنیا کے انسان برابر ہیں۔نہ کوئی ادنیٰ اور نہ کوئی اعلیٰ۔مگر سپر طاقتیں سرحدوں کے نام پر تیسری دنیا کے لیے ایسے گڑھے کھود چکی ہیں جن میں وہ تیسری دنیا کے ان ممالک کو گرا رہی ہیں اور پس پردہ ڈور ہلا کر انھیں کٹھ پتلیوں کی طرح لڑوا رہی ہیں۔اگر یہ ڈور ٹوٹ بھی جائے فوراً کوئی دوسرا ڈور ڈال کر لڑائی کا یہ سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔توانائی کو توانائی سے ضرب دے کر کھیل جاری رکھتے ہیں۔

افسانہ ''گھنٹہ گھر'' آزادی اور پابندی کے درمیان نہ ختم ہونے والی جنگ پر لکھا گیا افسانہ ہے۔اس افسانے میں کرداروں کے ذریعے زندگی کے اتار چڑھاؤ،اعلیٰ ادنیٰ کی تفریق اور طبقوں کے درمیان جنگ کو دکھایا گیا ہے۔یہ افسانہ زندگی کی کوکھ سے جنم لینے والی کہانی ہے جہاں گھنٹہ گھر زندگی کی علامت ہے۔امیر،غریب،فقیر،دیوانے،معصوم،چالاک اور مظلوم سب اس کے گرد گھومتے ہیں۔گھڑیال کی سوئیاں اعلیٰ اور ادنیٰ کے دو طبقے ہیں۔ان دونوں کے درمیان کسی تیسرے طبقے کو آنے کی کوئی گنجائش نہیں۔یعنی گھڑیال کی بڑی سوئی ہمیشہ چھوٹی سوئی پر غالب ہے۔افسانے کے آخر میں نوری اور بلو کی موت طبقوں کے فرق کو واضح کرتی ہے۔

افسانہ ''بندر اور ملیریا'' میں بندروں کی صورت میں ترقی پذیر اقوام اور گوروں کی صورت میں سپر طاقتوں کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔افسانے کا موضوع ظلم،جبر اور استحصال کے گرد گھومتی ہے۔سپر طاقتوں کی خواہشات کو افسانے میں بڑی خوبصورتی سے دکھایا گیا ہے۔

> ''جب بندروں کی پہلی کھیپ آئی تو وہ حیران رہ گیا کیونکہ اس نے پہلے کبھی اتنے بندر نہیں دیکھے تھے۔اسے یوں معلوم ہوا جیسے پرانے زمانے میں کوئی فوجی دستہ کسی شہر پر قبضے کے بعد غلاموں کی ایک ایسی ٹولی پکڑ لایا ہو جو غیرت مند اور محبِ وطن ہو اور باوجود قید ہونے کے ذہنی طور پر ابھی غلام نہیں بنے ہوں۔''(۷۔)

افسانے میں دو مختلف اقوام کو بندروں اور گوروں کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔آزادی پسندوں اور انکی جدوجہد کو بندروں کی صورت میں علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

Draft

"تقریباً چار سو بندر لائے گئے اور ان کو آہنی پنجروں میں بند کر دیا گیا۔ ان بندروں کو دو دو روز بھوکا رکھا جاتا اور پھر خوراک دی جاتی لیکن دو دو روز بھی کئی کئی بندر خوراک نہ کھاتے تھے۔ تقریباً چھ ماہ بعد آدھے بندر جو اس کے خیال میں آزادی پسند تھے، مر گئے۔"(۸۔)

عرفان احمد بیگ پوری دنیا کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں۔ بندروں کے بدن سے جب خوراک کے بدلے خون نچوڑا جاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تیسری دنیا کا کوئی ملک ہے جس میں جاری جنگ کے بدلے انھیں امداد کے نام پر سپر طاقتیں لوٹ رہی ہے۔ درحقیقت سپر طاقتوں کی طرف سے امداد یا دفاع کے نام پر اسلحہ فروخت کرنا تیسری دنیا کے ممالک کو جنگ کی طرف دھکیلنا ہے۔ اور یہی اس افسانے کا موضوع بھی ہے جسے علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

افسانہ "چوتھا زاویہ" میں معاشی بوجھ کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ اس طبقے کی علامتی تصویر ہے کہ جنھیں زندگی ملنے کے باوجود فرصت کا ایک ایسا لمحہ نہیں ملا جس میں وہ زندگی کی اصلی روپ کو دیکھ سکے اور محسوس کر سکے۔ افسانے کے پس منظر میں تنہائی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور ایک ایسے کردار کی جھلک ملتی ہے جس نے کھیلنے کودنے کی عمر سے ہی معاشی بوجھ کندھے پر ڈال کر زندگی کی حسین لمحات سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہو۔ یہ کردار رومانیت کے افسردہ لمحوں سے فلسفیانہ سوچ تک ایک ایسے زاویے کی متلاشی ہے کہ جس میں اپنے آپ سے الجھی آنسوؤں میں ڈوبی خوشی کا لمحہ میسر ہو اور وہ اس زوایے کو چوتھا زاویہ کہتا ہے۔ یہ کردار اس چوتھے زاویے کو پانا چاہتا ہے۔ کہ جسے عمر، زندگی اور وقت کی پیمائش کے لیے کائنات میں اچھال دی گئی ہے اور اسے پا کر وہ کچھ لمحے اپنے لیے بھی جینا چاہتا ہے۔

افسانہ "گنگ" افغان روس جنگ کے تناظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ افغانستان میں روسی مداخلت سے پیدا ہونے والے مسائل کا ادراک صرف وہی شخص کر سکتا ہے کہ جس نے ان حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ افسانے کا گُنگا کردار بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ جس نے جنگ زدہ ماحول میں آنکھ کھولی اور اس ماحول میں پرورش بھی پائی۔ حالات کو بدلتے ہوئے بھی دیکھا اور دوسروں کے کہنے پر جنگ میں شرکت کر کے حالات کو بدلنے کی کوشش بھی کی۔ مفادات کس طرح انتحصال کو جنم دیتے ہے وہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ یہ افسانہ ایک طرح سے ان تمام باشعور، مہذب اور ترقی یافتہ اقوام پر ایک طرح سے طنز ہے کہ

جنھوں نے امن کے نام پر نہ ختم ہونے والی جنگ کو تیسری دنیا پر مسلط کیا ہے۔

افسانے میں ''گنگ'' کا کردار جب یہ سوال کرتا ہے۔

''یہ لوگ کیوں جنگ کرتے ہیں، کیوں ایک دوسرے کو ہلاک کرتے ہیں۔؟''(۹۔)

اور پھر خود ہی اس سوال کا جواب بھی دیتا ہے۔

''شاید اسی لیے یہ لوگ سن سکتے ہیں، بول سکتے ہیں۔ پھر ان لوگوں سے بھی زیادہ وہ لوگ جو پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور یہ لوگ جب بہت کچھ جان لیتے ہیں تو اسی طرح کم جاننے والوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔''(۱۰۔)

افسانے کے موضوع سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام ترقی یافتہ اقوام نام نہاد ترقی کے نام پر تیسری دنیا کے لوگوں کو دھوکہ دینے میں مصروف ہیں۔ نام نہاد ترقی نے دنیا کے امن کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اس کے ذمہ دار بھی یہی ترقی یافتہ اقوام ہے کہ جو اپنی مفادات کی خاطر تیسری دنیا پر ایک جنگ مسلط کر چکے ہیں۔ اور جدید سے جدید تر اسلحہ فروخت کر کے مراعات حاصل کر رہے ہیں۔

عرفان احمد بیگ ایک سوشل ریسرچر بھی ہیں۔ اس لیے وہ زندگی کے ہر زاویے پر نظر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان موضوعات کو بھی صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے لوگ دانستہ طور پر پہلوتہی کرتے ہیں۔ غیرت کے نام پر قتل ایک ایسی رسم ہے کہ جس میں بعض قوتیں جاگیر، پیسہ اور دیگر مراعات کی خاطر کسی پر بھی جھوٹا الزام لگا کر غیرت کے نام پر اُسے قتل کر دیتی ہے۔ عرفان احمد بیگ نے بھی اس موضوع کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے اسے افسانے کی شکل دی ہے۔

افسانہ ''بول'' میں کاروکاری کی اسی قبیح رسم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح مذموم مقاصد کے لیے اس رسم کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی اس بارے میں رقمطراز ہیں:۔

Draft

"اس افسانے میں ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بجائے واقعات کا حسن ہے۔ اس افسانے میں افسانوی فضا سے زیادہ ایک داستان گو کی کرشمہ سازی اور سحر بیانی جھلکتی ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس رسم کے حوالے سے واقعات صرف سنے ہی جا سکتے ہیں۔ درندہ صفت لوگوں میں گھرے کاروکاری کی شکار کرداروں تک رسائی کسی انسان تو کیا تخیل کی بھی دسترس سے بعید ہے۔ جس کے ذریعے اُن کرداروں کے جذبات اور احساسات کو بھی زبان مل سکتی۔"(۱۱)

جہاں کاروکاری کی رسم غلط ہے وہی اس کے کچھ ایسی منفی پہلو بھی ہیں کہ جو زندگی بھر جاری رہتے ہیں۔ جس کی مثال جان بخشی کی رسم ہے۔ اس رسم کے تحت کاری کو بچانے کے لیے چھوٹی چھوٹی بچیوں کو جان بخشی کی رسم کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے اور وہ ایک ایسی دلدل میں جا پھنستی ہے کہ جس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

افسانہ "انصاف سے پہلے" میں عزت کی خاطر عدالتوں میں دھکے کھاتی عورتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عورتوں کو درپیش مسائل کے ساتھ قانونی داؤ پیچ کی غلطیوں کو بھی افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ عدالتوں میں انصاف کے نام پر جس طرح عورت کی تذلیل کی جاتی ہے وہ کسی المیے سے کم نہیں۔ مردوں کی بے حسی اور ہوس کو بھی افسانے میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جو ہر واقعے کا ذمے دار عورت کو ہی ٹھہراتے ہیں۔

افسانہ "کوکلا چھپاکی" میں انسانی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ علامتی انداز میں اس کھیل کے ذریے موت، خوف اور زندگی کی تضادات کی وضاحت کی گئی ہے:

" کوکلا چھپاکی جمعرات آئی ہے
جو آگے پیچھے دیکھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کی شامت آئی ہے۔" (۱۲)

مذکورہ بالا لائنیں اِس تضاد کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ زندگی بھی کوکلا چھپاکی کے کھیل جیسا ہے۔ جس میں مزے کے

Draft

لمحات، لطافتیں اور سرور بھی ہے مگر ساتھ ساتھ خوف اور غم کے لمحات بھی موجود ہیں۔ اور انہی کشمکش میں زندگی گزر جاتی ہے۔ جب تک زندگی کی سمجھ آجائے اس وقت تک عمر کی نقدی ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح اِس کھیل میں آگے پیچھے دیکھنے والے کی شامت آتی ہے اور وہ کھیل کی دوڑ سے باہر ہو جاتا ہے۔

افسانہ "کبڑے مسافر" میں معاشی کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کہانی دو مسافروں کے زبانی بیان کی گئی ہے۔ معاشی مسائل عرفان احمد بیگ کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ عرفان احمد بیگ کے تمام افسانوں میں کسی نہ کسی طرح سے معاشی مسائل کی جھلک ملتی ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے معاشی مسائل کو ذاتی طور پر جھیلا ہے۔ "کبڑے مسافر" میں دو طبقوں کو دکھایا گیا ہے۔ ایک طبقہ وہ کبڑے مسافر ہے جن کی کندھوں پر دوسرا طبقہ سوار ہے۔ اول الذکر طبقہ معاشی بوجھ تلے دبا ہوا ہے اور آخر الذکر طبقہ انکی پیٹھ پیچھے عیاشیوں میں مصروف ہے۔ عرفان احمد بیگ کی زندگی محنت اور جہد مسلسل سے عبارت ہے اور شاید ماضی سے جڑی ایمانداری اور محنت کا ہی تسلسل تھا جس کے سبب معاشی ذمہ داریوں نے بہت کم عمری میں ہی انکا انتخاب کر لیا تھا یہی سبب ہے کہ زندگی کی شقاوت اور بے رحمی کا تجزیہ، مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے جتنے مواقع عرفان بیگ کو ملے وہ کم لکھنے والوں کے حصّے میں آئے ہوں گے۔ (۱۳) اس لیے معاشی اور اسے پیدا ہونے والے مسائل انکے پسندیدہ موضوع ہے۔

افسانہ "آخری رسوائی" میں بھی معاشی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی، قلیل تنخواہ میں گزارہ کرنے والے ملازمین کے مسائل کا اندازہ حقیقی زندگی میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ افسانہ اس قانون شکن سماج پر ایک طرح طنز بھی ہے۔ اس معاشرے میں جہاں ایماندار ملازمین کو جینے تک کے لالے پڑتے ہیں جبکہ اس کے برعکس رشوت خور عناصر کو ہر طرح کے مراعات حاصل ہے۔ اس افسانے میں منشیات کے استعمال اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو بھی دکھایا گیا ہے۔

افسانہ "ذرا سی بات" میں افریقہ میں ہونے والی نسل پرستی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سیاہ فام افریقیوں کی صورت میں پسے ہوئے طبقے اور نسل کشی کے شکار اقوام کو دکھایا گیا ہے۔ جبکہ گوروں کی صورت میں ان پر حاکم قوتوں کو دکھایا گیا ہے۔ گورے جو سیاہ فام لوگوں کو ذلیل اور نیچ سمجھتے ہیں اور آج بھی نسل پرستی کے نام پر انکا استحصال کر رہے ہیں۔ اور ذرا سی بات پر انہیں قتل بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

Draft

عرفان احمد بیگ تیسری دنیا اور اس میں بسنے والے انسان کے مسائل سے واقف ہیں۔ اس لیے انکے افسانوں کے موضوعات تیسری دنیا سے لیے گئے ہیں۔ انکے افسانے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں پیار، محبت، امن کے علمبردار ہے۔ جبر اور استحصال چاہے کسی بھی صورت میں ہو وہ اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ نسل پرستی ہو کہ جنگ زدہ ماحول وہ انھیں اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ انکے افسانوں میں عورت کو جنس، محبت اور سماج کے مسائل کا سامنا ہے۔ مگر وہ ایک زندہ گوشت پوست کی عورت ہے۔ جو احساس رکھتی بھی ہے اور احساس دلانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ عرفان بیگ کے افسانوں کے بارے میں حالی سیدی لکھتے ہیں۔

> "ان کے افسانوں میں ضمیر کی آواز پوری شدت سے سنائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں جذبات و لطافت کا بہت ہی دل آویز اظہار نظر آتا ہے۔"(۱۴)

بحیثیت مجموعی ڈاکٹر عرفان احمد بیگ ایک سماجی افسانہ نگار ہے۔ انکے افسانوں کی جڑیں اسی سماج سے پھوٹتی ہیں۔ اور وہ آج کے سیاسی، تہذیبی، معاشی و معاشرتی مسائل کو قاری کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

Draft

ج:۔ ''گتے کے پہلوان'' فنی جائزہ:۔

فن اور فکر کسی بھی ادبی شہ پارے کے لازمی جزو قرار دیے جاتے ہیں۔فکر مصنف کے ذہنی میلان کی وضاحت کرتی ہے مگر فن اسکے فنکار ہونے کا ثبوت ہے۔جب کسی ادبی شہ پارے کا فنی تجزیہ کیا جاتا ہے تو فکر کے پہلو میں فن کو رکھ کر ان تمام فنی عناصر کی باریک بینی سے جانچ پڑتال کی جاتی ہے جو اس شہ پارے کو فنی حوالے سے ایک اہم شاہکار قرار دے سکتے ہیں۔

تکنیک کے حوالے سے کردار، مکالمہ، پلاٹ، عنوان، وحدت تاثر، تجسس و جستجو، اسلوب نگارش ان تمام فنی عناصر کی روشنی میں کسی بھی افسانے کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔اور اسکے معائب و محاسن کی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے۔ افسانوی ادب میں جدت کی وجہ سے مختلف افسانہ نگاروں نے فنی عناصر میں تبدیلیاں کر کے اپنی اپنی الگ راہ نکالی ہے۔

عرفان احمد بیگ کے فن کا ''گتے کے پہلوان'' کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''گتے کے پہلوان'' کے تمام افسانے فنی عناصر سے بھرپور ہیں۔تکنیک سے لے کر اسلوب تک تمام فنی عناصر کا بھرپور استعمال عرفان بیگ کے افسانوں میں ملتا ہے۔''گتے کے پہلوان'' افسانہ نگاری کی جہت میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اور انہوں نے فن افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنی ایک الگ راہ نکال کر دور جدید کے افسانہ نگاروں میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔

ذیل میں ''گتے کے پہلوان'' میں شامل افسانوں کا کردار نگاری، مکالمہ نگاری، پلاٹ، وحدت تاثر، تجسس و جستجو اور اسلوبِ نگارش کے حوالے سے باری باری جائزہ لیا گیا ہے۔

افسانے میں کردار نگاری ایک اہم عنصر سمجھی جاتی ہے۔افسانے کے موضوع اور پس منظر کو واضح کرنے کے لیے کردار نگاری ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ پہلے پہل قصے کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر اور کرداروں کی بھرمار تھی۔وہ تمام کردار اچھائی یا تو برائی کا پیکر ہوتے۔حلیہ، عادات، مکالمے غرض کہ ان تمام کرداروں میں حقیقی انسان کی کوئی جھلک نہیں تھی۔مگر آہستہ آہستہ داستان، افسانے، ناول سب میں جدت آنے کی وجہ سے کردار نگاری میں بھی جدت آگئی۔

Draft

اُردو افسانے میں جدت ترقی پسند تحریک کے زیر اثر آئی۔ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے افسانہ نگاری میں حقیقت نگاری کا رجحان نمایاں ہوا۔ جس کے زیر اثر افسانے میں نئے موضوعات سامنے آئے اور کردار نگاری کے حوالے سے تجربے کیے گئے۔ اور مافوق الفطرت کرداروں کی بجائے ایک عام انسان کو کرداروں کی صورت میں پیش کیا جانے لگا۔ اسی وجہ سے کرداروں میں ایک فطری رنگ نظر آنے لگا۔

افسانے کے کردار اگر مصنوعی ہوں تو افسانہ بے جان اور بے تاثیر ہوگا۔ کردار ایک جیتا جاگتا مجسمہ ہے۔ اسکے حرکات وسکنات میں ایک زندہ فرد کی جھلک محسوس کی جانی چاہیے۔ کردار اچھے بھی ہو سکتے ہے اور بُرے بھی۔ مگر ان کرداروں کو ان کے مزاج کے مطابق پیش کرنے کا فن افسانہ نگار کو آنا چاہیے۔ کامیاب افسانہ نگار کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر عمر اور مزاج کے کردار کو کس فنی مہارت سے پیش کر سکتا ہے یا کس طرح سے کوئی بہترین کردار تخلیق کر سکتا ہے۔ اس لیے جب بات کرداروں کی ہوتی ہے تو کرداروں کی ذہنی حالت اور سطح، حرکات وسکنات کے ساتھ ساتھ ہمیں کرداروں کی عمر کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔

"گنتے کے پہلوان" میں کردار نگاری کے حوالے سے کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ عرفان احمد بیگ نے زندگی کی جتنی جہتوں کو دیکھا اور سمجھا اسے کرداروں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کے کردار تیسری دنیا کے پسے ہوئے تھکے ماندہ انسان ہیں۔ معاشی جبر سے پیدا شدہ جنگ اور قحط کو محسوس کرنے والے انسان اس کے پسندیدہ کردار ہیں۔

عرفان احمد بیگ انسانی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں میں کرداروں کی نفسیاتی حالت، ذہنی سطح اور کشمکش کو خاص طور سے پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ "مشرق" میں شمیم کا کردار بھی اسی قسم کا ہے۔ شمیم جنسی ناآسودگی کی شکار ایک مشرقی لڑکی کا کردار ہے۔ وہ ایک مشرقی عورت ہونے کے باوجود جنسی کیفیات سے واقف ہے۔ اور انھیں محسوس بھی کرنا چاہتی ہے۔ مگر ایک عورت اور خاص کر ایک مشرقی عورت ہونے کے ناطے اُسے کہیں پابندیوں کا سامنا ہے۔ افسانہ نگار نے "شمیم" کے کردار کی ذہنی حالت، نفسیاتی کشمکش اور رفاقت کے احساس کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ "مشرق" کا دوسرا مرکزی کردار جاوید کا ہے۔ جاوید کا کردار ایک عجیب قسم کے مرد کا کردار ہے جو کسی یونیورسٹی میں پڑھانے کے باوجود دقیانوسی خیالات کا مالک ہے۔ وہ عورتوں کے احساس، جذبات اور رفاقت کو سمجھنے کی بجائے محض ان سے کھیلنا پسند کرتا ہے۔ اس کردار کی صورت میں مشرق کے تمام روایتی کرداروں کی عکاسی کی گئی ہے جو عورت کو صرف ایک دل بہلانے کا کھلونا سمجھتے ہیں۔ اور جنھیں عورت محض

Draft

استعمال کی کوئی چیز لگتی ہے۔

"کبڑے مسافر، چوتھا زاویہ، گنجے کے پہلوان، بندر اور ملیریا" کے کردار معاشی جبر سے پیدا ہونے والے کردار ہیں۔"بندر اور ملیریا" کا کردار ایک سادہ لوح اور محنت کش دیہاتی کا کردار ہے۔ جسے معاشی جستجو نے لاکر بندروں کی نگرانی پر معمور کر دیا ہے۔ یہ کردار دیہاتی ہونے کے باوجود ایک نظریاتی سوچ رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ بندروں کو بے جا غلام بنایا گیا ہے۔اور تیسری دنیا کے انسانوں کی طرح ان پر بھی کئی قسم کی پابندیاں عائد ہیں۔اور گورے اپنی مفادات کی خاطر ان کا خون چوستے ہیں۔معاشی ریشہ دوانیوں سے پھوٹنے والا ایک کردار افسانہ "گنجے کے پہلوان" میں سامنے آتا ہے۔ یہ ایک سرکاری ملازم کا کردار لگتا ہے۔اس کردار کی مصروفیت اور ذہنی تھکاوٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک کلرک کا کردار ہے جو دفتر کے کام کا بوجھ اور تھکاوٹ گھر میں بھی لیے پھرتا ہے۔فائلوں کے بوجھ کی وجہ سے اس کردار کو گھر میں بھی سکون میسر نہیں۔عرفان احمد بیگ کے دوسرے کرداروں کی طرح یہ کردار بھی سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور دنیا کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا ہنر بھی جانتا ہے۔ افسانہ "گنگ" کا کردار بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔آزادی اور پابندیوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں سے ابھرنے والے اس کردار کو بھی سوچنے کی صلاحیت ہے۔بظاہر یہ کردار گونگا ہونے کے باوجود افغان، روس جنگ زدہ ماحول کو دنیا کے لیے خطرناک سمجھتا ہے۔

ذمہ داریوں کا بوجھ جب ایک ہی شخص کے کندھے پر آجاتا ہے تو اسکی مثال کبڑے کی سی ہوتی ہے، جس کے کندھے پر ہمیشہ بوجھ لدھا رہتا ہے۔اور وہ چاہ کر بھی اس بوجھ کو کندھے سے نہیں اتار پاتا۔افسانہ "کبڑے مسافر" کے کردار بھی ان ہی ذمہ داریوں کی بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ان دونوں کرداروں کے درمیان مکالمے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ دونوں مسافر اپنے لیے زندگی کا کوئی آسودہ لمحہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ دونوں کردار معاشی بوجھ سے فرار پا کر سکون کے چند لمحے جینا چاہتے ہیں۔اور ان لمحوں کے متلاشی ہیں جہاں ان کے کندھوں پر کسی دوسرے کا بار نہ ہو۔

سکون کا متلاشی ایک اور کردار افسانہ "چوتھا زاویہ" کا بھی ہے۔تنہائی کے پس منظر سے ابھرتے اس کردار میں اپنی ذات کی کھوج لگانے کی لگن بہت زیادہ ہے۔ یہ کردار اس چوتھے زاویے کا متلاشی ہے کہ جس کو پا کر اُسے اپنی ذات کے اندر سکون کی کوئی پناہ گاہ مل جائے۔"کوکھلا چھپاکی" کا کردار زندگی، موت اور خوف کے درمیان پھنسے انسان کا کردار ہے۔عرفان احمد بیگ کا فن یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی صرف آوازوں کے ذریعے ہی کرداروں کی سراپا، سوچ اور ذہنی حالت کو پیش کرتے ہیں۔"چوتھا زاویہ"

Draft

اور”کوکھلا چھپائی“ کے کرداروں میں تنہائی اور اس کے پس منظر سے اُبھرتے ہوئے مکالمے اور آوازیں زیادہ ہیں۔

”ہبول، گھنٹہ گھر، انصاف سے پہلے“ جیسے افسانوں میں مختلف کردار تخلیق کیے گئے ہیں۔ مرد اور عورت کے روپ کو ان افسانوں میں دکھایا گیا ہے۔ افسانہ ”ہبول“ میں ہبول کا کردار محبت کے جذبات سے بھری لڑکی کا روپ دھارتی ہے۔ یہ کردار کاروکاری کے نام پر قتل ہونے والی لڑکیوں کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ ہاشم کی ماں کے کردار میں ایک جاگیرداری کا اصل نین ونقش موجود ہے کہ جس کے ہاں دوراندیشی بھی ہے اور جاہ وجلال بھی۔ اس افسانے میں ہاشم ایک باشعور نوجوان کا کردار ادا کرتا ہے۔ مگر یہ کردار بھی کاروکاری کی قبیح رسم کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ امیر جان خان کا کردار ایک سخت گیر قسم کے جاگیردار کا عکاس ہے جو اپنے مفاد کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔

افسانہ ”گھنٹہ گھر“ میں ممتا کی شدت وجذبہ کو ایک پاگل لڑکی نوری کی کردار میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ عرفانؔ احمد بیگ کا یہ کردار زندہ رہنے والے کرداروں میں سے ایک ہے۔ افسانے میں گڈے کی خاطر نوری کا بننا سنورنا اس کے اندر ممتا کی جھلک واضح کرتی ہے۔ مگر دوسری طرف افسانے میں نوری کی عصمت دری اس کردار کی بے بسی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ افسانے کے دوسرے اہم کرداروں میں بابا علی بخش کا کردار کچھ مضبوط اور افسانے میں متحرک نظر آتا ہے۔ بابا علی بخش ایک جہاں دیدہ اور مردم شناس انسان ہے۔ اس کردار نے ذاتی طور پر زندگی کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا اور محسوس بھی کیا۔ اس لیے یہ کردار نوری کو اجڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ بنیادی طور پر اس کردار میں رحمدلی زیادہ ہے۔ بلو اور دوسرے کردار افسانے کو آگے لے جانے میں مدد تو دیتے ہیں مگر انکا کوئی خاص تاثر نہیں ہے۔

Draft

افسانہ ”انصاف سے پہلے“ میں عزت کی خاطر تگ و دو کرتی اور زمانے سے لڑتی عورت کو شگفتہ کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ شگفتہ کا کردار ایک ایسی عورت کا کردار ہے جسے اپنی عزت بہت پیاری ہے اور اس کی دفاع کے لیے وہ عدالتوں تک جا پہنچتی ہے۔ عورت کی بے بسی کو اس کردار کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ شگفتہ کو زمانے کے ساتھ ساتھ اس کے شوہر اور بیٹا بھی اُس واقعے کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے جس کے سبب وہ عدالت تک جا پہنچی ہے۔ اس لیے یہ کردار انصاف سے پہلے ہی خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ افسانے میں دوسرا مرکزی کردار رشید کا ہے۔ یہ کردار بھی معاشی جبر سے پیدا شدہ انسان لگتا ہے۔ اس کردار میں مرد کے اس روپ کو سامنے لایا گیا ہے کہ مرد گھر سے باہر قدم نکلنے پر بھی عورت کو غلط سمجھتا ہے۔ رشید جیسے کردار لمحہ بھر میں عورت کی عمر بھر کی رفاقت بھول جاتے ہیں۔ رشید کا بیٹا بھی انہی

خیالات کا مالک ہے۔ جبکہ بیٹی، ماں کے ساتھ ہی خودکشی کرلیتی ہے۔ شیخ کے کردار میں ایک جنس زدہ مرد کی جھلک ملتی ہے جو عورت کو ہمیشہ اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے آزماتا ہے۔

عرفانؔ احمد بیگ کے افسانوں میں عورتوں کے مختلف روپ سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے افسانوں میں مشرق کی جنسی ناآسودگی کی شکار لڑکی شمیم، جذبہ امومیت سے بھری نوری، غیرت کے نام پر قتل ہونے والی بول، عزت کی خاطر عدالتوں کے چکر کاٹتی شگفتہ کو ہمارے سامنے اسطرح لاکھڑا کردیتے ہیں کہ قاری ان کرداروں کے حرکات و سکنات کے ساتھ ان کے نفسیاتی مسائل تک دسترس حاصل کرلیتا ہیں۔ اور ان مسائل سے الجھ بھی جاتا ہیں۔ قاری ان مسائل کو نظرانداز کرکے فرار کی راہ بھی حاصل نہیں کرتا۔ تو دوسری طرف وہ "ذرا سی بات" کے مارگریٹ کی صورت میں مغربی عورت کی ناز و ادا، لاپروائی، لاابالی پن کو سامنے لاتے ہیں۔

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ کردارنگاری کے حوالے سے عرفان احمد بیگ کا فن بام عروج پر ہے۔ اس کے تمام کردار معاشرے کے زندہ کردار محسوس ہوتے ہیں۔ عرفانؔ احمد بیگ کے کرداروں کے پاس احساس بھی ہے جو سوچ بھی سکتے ہیں اور سوچنے پر مجبور بھی کرتے ہیں۔ یہ کردار ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھا بھی سکتے ہیں اور آواز اٹھانا سکھا بھی سکتے ہیں۔ عرفانؔ احمد بیگ کے افسانے تیسری دنیا کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس لیے اِن کے کردار بھی اسی معاشرے کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔

Draft

عرفانؔ بیگ کے افسانے زیادہ تر بیانیہ روپ لیے ہوئے ہیں۔ اس لیے انکے ہاں مکالمہ نگاری بہت کم پائی جاتی ہے۔ مکالمہ دو افراد کے درمیان گفتگو کا نام ہے۔ مکالمہ نگاری کے ذریعے افسانے کی حسن میں خوبصورتی پیدا کی جاسکتی ہے۔ مکالمہ نگاری کرتے وقت کرداروں کی عمر، سوچ اور ذہنی حالت کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اور یہ افسانہ نگار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ کرداروں کے مزاج کے مطابق ان سے کس طرح کے کامیاب مکالے کہلوا سکتا ہے۔ اگر ایک بچے کی زبان میں فلسفیانہ باتیں کی جائیں تو افسانہ پر عیب نظر آئے گا۔ بالکل اسی طرح اگر کسی ذہنی بالغ شخص سے کسی بچے کے مکالے کہلوائے جائے تو وہ بھی فنی معائب میں شمار کیے جاتے ہیں۔

"گتے کے پہلوان" کے چند ایک افسانوں کو چھوڑ کر باقی افسانوں میں خال خال ہی مکالمہ نگاری پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر افسانے بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ عرفانؔ احمد بیگ کے ان چند افسانوں میں بھی انہوں نے مکالمہ نگاری کی

صنعت کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

مکالمہ نگاری کے حوالے سے "انعطاف نظر" ایک کامیاب افسانہ ہے۔ یہ افسانہ شروع سے لے کر آخر تک دو کرداراارشد اور خالد کے درمیان مکالموں پر مشتمل ہیں۔

"اچھا چھوڑو۔تم انعطاف نظر اور انعطاف روشنی کی بات
کر رہے تھے۔
ہاں روشنی بھی ایک طاقت ہے اور نظر بھی۔لیکن نظر روشنی کے مقابلے میں
بہت کم طاقت ہے۔"(۱۵۔)

اس افسانے میں مکالمے فلسفیانہ رنگ میں پیش کیے گئے ہیں۔سوال در سوال اور نفسیاتی کش مکش کی کیفیت کو بہت خوبصورت انداز سے مکالموں کی شکل دے دی گئی ہے۔

افسانہ "کبڑے مسافر" میں وہی تکنیک برتی گئی ہے جو "انعطاف نظر" میں استعمال کی گئی ہے۔یعنی یہاں بھی شروع سے لے کر آخر تک کہانی دو کرداروں کے درمیان ہونے والے مکالموں کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔اس افسانے کے مکالموں میں بھی سوال در سوال کی کیفیت زیادہ ہے۔

" سورج آہستہ آہستہ اُوپر کو اُٹھ رہا ہے،
ہاں تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو کیونکہ اب ہمارے سائے چھوٹے ہو رہے
ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔
کیا سائے چھوٹے ہوتے ہوتے ہم میں جذب ہو جائینگے؟
نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کیوں؟"(۱۶۔)

"کبڑے مسافر" کے مکالموں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مکالمے مرد اور عورت کے درمیان ہو رہے ہیں۔ذہنی طور پر دونوں کردار پختہ بھی ہیں لیکن اس کے باوجود عورت کی جلد بازی کا اسکی گفتگو سے پتہ چل رہا ہے۔بار بار کیوں؟ کا تکرار

Draft

عورتوں کی جلد بازی اور بار بار سوال کرنے کی عادت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

اپنی ذات اور اپنے اندر سے اُبھرنے والی شعور کی آوازوں کے ساتھ گفتگو کو خود کلامی کہا جاتا ہے۔ خود کلامی بھی ایک قسم کا مکالمہ ہی ہوتا ہے۔ عرفانَ احمد بیگ کا فن یہ ہے کہ انہوں نے خود کلامی کی تکنیک کو استعمال کر کے کامیاب افسانے لکھے ہیں۔ ''کوکھلا چھپائی'' اور ''چوتھا زاویہ'' خود کلامی تکنیک کے کامیاب افسانے ہیں۔ ان افسانوں کے کردار اپنے آپ سے محوِ کلام ہو کر اپنی ذات اور زندگی کی گرہیں کھول رہی ہیں۔

افسانہ ''بول'' مکالمہ نگاری کے حوالے سے ایک کامیاب افسانہ ہے۔ مختلف کردار ہونے کی وجہ سے اس افسانے کے مکالموں میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ کردار ''بول'' کے مکالمے سیدھی سادی دیہاتی لڑکی کے مکالمے ہیں۔ بول کی گفتگو سے مشرقی عورت کی شرم وحیاء بھی جھلکتی ہے۔ بول اور ہاشم کے درمیان ہونے والے مکالمہ دیکھیے:

> ''تمھارا نام کیا ہے ۔ ۔۔۔۔۔۔ بول۔۔۔۔۔۔۔ کیا وہ چونک اٹھا۔۔۔۔۔
> تم ۔۔۔۔۔ تم اتنی پیاری ہو اور نام بول۔۔۔۔۔ وہ ہنستی ہوئی بولی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میری ماں نے یہ نام اس لیے رکھا تھا کہ مجھے کسی کی نظر نہ لگے۔'' (۱۷۔)

Draft

ہاشم کے مکالموں میں مردانہ وجاہت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ پیار کے ساتھ ساتھ غیرت اور ہمت سے بھرپور مکالمے ہاشم کے ہاں ملتے ہیں۔ اس لیے جب وہ بول سے باتیں کرتا ہے تو کومل اور شیریں لہجے میں مگر آخر میں جب وہ یہ کہتا ہے کہ:

> ''بے غیرتو! باہر نکلو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم اپنے گھر کی کوئی بیٹی تمھیں نہیں دیں گے۔۔۔۔۔۔۔ باہر نکلو بے غیرتو! ۔۔۔ '' (۱۸۔)

تو ایک مردانہ وجاہت کا پیکر سامنے آتا ہے۔ ہاشم کی ماں کے مکالمے خالص طنز سے بھری جاگیردارنی کی مکالمے محسوس ہوتی ہے۔

"کہاں سے لاتے دو لڑکیاں جن کی عمر سات سال سے اوپر
ہوں۔۔۔۔اس لیے بانو کے دانت نکال دیئے گئے ہیں۔"(۱۹۔)

امیر جان خان کے مکالموں میں روایتی جاگیرداروں کی گفتگو کی جھلک ملتی ہے۔

"کالی تھی۔۔۔۔۔۔ اس کے باپ اور بھائیوں نے اسے مار دیا
۔۔۔۔۔۔۔۔وہ تو شکر کرو کہ میرے آدمی موقع پر پہنچ گئے۔۔۔۔" (۲۰۔)

عرفان بیگ کے افسانے زیادہ تر راوی کے زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔مگر یہ خال خال مکالمے بھی انکی فنی مہارت کا ثبوت ہیں۔عرفان بیگ کے مکالموں کی روانی اور سلاست کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ ایک ڈرامہ نگار بھی ہے اور اداکار بھی۔ریڈیو اور ٹی وی کی دنیا سے وابستگی کی وجہ سے ان کے مکالمے کرداروں کی ذات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

"گتے کے پہلوان" کا منظر نگاری کے حوالے سے فنی تجزیہ کیا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس افسانوی مجموعے میں منظر نگاری کے حوالے سے بھی کافی تنوع ہے۔

منظر نگاری ایک فن ہے۔اور فن کے اعتبار سے کہانی میں منظروں کو جزئیات کے ساتھ بیان کرنا انتہائی ضروری خیال بھی کیا جاتا ہے۔اور یہی منظر کشی قاری کی دلچسپی کا باعث بھی بنتا ہے۔عموماً عرفان احمد بیگ کے افسانوں کا آغاز ہی ایک خوبصورت منظر سے ہوتا ہے۔اور پھر جگہ جگہ منظر نگاری کا استعمال کرتے ہوئے افسانے کو اختتام تک پہنچا دیتے ہے۔منظر نگاری صرف فطرت کی نہیں ہوتی بلکہ ہر اس چیز کو جزئیات سے بیان کرنا کہ جس کو پڑھ کر قاری کے سامنے اسکا نقشہ آجائے یہ بھی منظر نگاری کے ذیل میں شامل ہے۔افسانہ "گتے کے پہلوان" کے ابتدائی حصے میں وہ کچھ اس طرح سے منظر کشی کرتے ہیں۔

"ہفتہ وار چھٹی کو سوچتے ہوئے وہ شام ہی کو دفتر اپنے گھر لے آیا
تھا۔فائلیں جن کے درمیان کاغذ لیکن بڑے عجیب ہندسوں والے سرخ اور
نیلی روشنائی سے کہیں تفریق، کہیں جمع، کہیں ضرب، کہیں تقسیم یا مساوی کے
نشانات، ہر جگہ مضحکہ خیز دکھائی دے رہے تھے۔"(۲۱۔)

Draft

عرفان بیگ نے افسانوں کے مجموعی مناظر شہری زندگی سے لیے ہیں۔"گھنٹہ گھر"اور"سیڑھی پر رکھی آنکھ"میں وہ شہروں کی گنجان آبادی اوران سے پیدا ہونے والے مسائل کو منظروں کی صورت میں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔"گھنٹہ گھر"کی ابتداء کچھ یوں ہوتی ہے۔

"گھنٹہ گھر کے گرد سڑک کا دائرہ تھا اور اس دائرے سے پھر سات سڑکیں جو اب بازار کہلائے ، نکلتے تھے۔گھنٹہ گھر کے گرد دائرے کی شکل میں گھومنے والی سڑک پر گھنٹہ گھر کی عمارت کے ساتھ بھی دکانیں تھیں۔اس کے سگریٹ پان کا کیبن گھنٹہ گھر سے نکلنے والے کپڑا بازار کے سرے پر سینما سے پہلے تھا۔گھنٹہ گھر کے مینار پر چاروں اطراف میں بڑی بڑی گھڑیاں تھیں جن سے ان ساتوں بازار میں گھومنے پھرنے والے لوگ آسانی سے وقت دیکھ سکتے تھے اور جو لوگ وقت نہیں دیکھ سکتے تھے وہ ہر گھنٹے کے بعد گھڑیال کی نوبت سن لیتے تھے۔"(۲۲۔)

افسانہ"سیڑھی پر رکھی آنکھ"میں بھی شہری مصروف زندگی کو موضوع بنا کر انہیں تصویری شکل دی ہے۔

"یہ علاقہ اب شہر کا مصروف ترین اور گنجان آباد علاقہ بن چکا تھا۔چاروں جانب کشادہ سڑکیں بڑی اور تھوک مارکیٹوں اور بازاروں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔"(۲۳۔)

جزئیات کے ساتھ منظر نگاری افسانہ"چوتھا زاویہ"میں ملتا ہے

"کھیتوں کی بالیوں پر لیٹی لیٹی سے ہوا نے ہولے ہولے اٹھتی ہوئی خوشبو کو گود میں بھینچتے ہوئے انگڑائی لی۔"(۲۴۔)

Draft

افسانہ ''ببول'' میں گاؤں کی مناظر کو خوبصورتی کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں فطرت اور کرداروں کے سراپے کو ساتھ ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نہر کنارے ببول کی سراپا نگاری اس طرح ہے۔

''وہ نہر کے دوسرے کنارے پر درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ شوخ رنگوں کے پھولدار لباس میں ایک سانولی لڑکی اس کے سینے اور پیٹ پر دونوں ہاتھوں سے مالش کر رہی تھی۔ کانسی رنگ کے باریک بڑے دوپٹے سے اُس کا سانولا چہرہ خیمہ نما انداز میں ڈھنپا ہوا تھا۔'' (۲۵۔)

افسانہ ''ببول'' میں ایک اور جگہ پر بھی فطری مناظر اور کرداروں کی سراپا نگاری کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''نہر کا بہتا اور کناروں سے ٹکراتا پانی، جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں سے گزرتی ہوئی ہوا کی آوازیں، پرندوں کی دور و نزدیک آوازیں۔۔۔۔ ان سب آوازوں میں یک لخت۔۔۔۔ ببول کی ہنسی کی جھرنا پھوٹا۔ چھم چھم کرتی پازیبوں کے ساتھ وہ تیزی سے بھاگ گئی۔ پیلے پیلے پھولوں والی قمیض شلوار اور پیلی اور دھانی رنگوں کی چندری کے نیچے سے کمر تک آئی ہوئی چٹیا۔۔۔۔۔ کے آخر پر کوہلوں پر لگی رنگوں اور موتیوں کے بنے پھندنے۔۔۔۔'' (۲۶۔)

افسانہ ''چوتھا زاویہ'' میں بھی وہ کرداروں کی سراپا نگاری کرتے ہیں۔

''اس کی کنپٹی اور آنکھ کے درمیان میں کوئی رگ اچانک زور سے پھڑکی، آنسوؤں کی ایک لکیر اس کی دائیں آنکھ سے جھلکتی ہوئی اس کے ہونٹوں تک پہنچ گئی۔ اس نے زبان کی نوک سے فوراً اس پانی میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔ آنکھ میں ڈوبتے ہوئے عکس نے پھر جنبش کی۔۔'' (۲۷۔)

Draft

عرفان بیگ کے پیش کردہ مناظر میں کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا۔ انکے ہاں منظر نگاری فطرت سے ہم آہنگ نظر آتی ہے اور ایک حقیقی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ "گتے کے پہلوان" کے تمام مناظر فنی نقطہ نظر سے کمال اوج تک پہنچے ہوئے ہیں۔

"گتے کے پہلوان" کے افسانوں میں پلاٹ کی اہمیت زیادہ ہے۔ کسی بھی افسانے میں پلاٹ کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی جیسی ہوتی ہے تاکہ افسانے کی واقعات میں ربط اور تسلسل کا سلسلہ قائم رہے اور قاری افسانے میں کوئی جھول محسوس نہ کریں۔ بلکہ شروع سے لے کر آخر تک افسانے کو بڑی توجہ اور غور سے پڑھے۔ اس تناظر سے "گتے کے پہلوان" کا فنی جائزہ کیا جائے تو سوائے چند ایک افسانوں کو چھوڑ کر عموماً دیگر افسانے بہترین اور سلجھے ہوئے پلاٹ کی مثال ہے۔

ساخت کے اعتبار سے پلاٹ کے دو اقسام ہیں۔ ایک وہ افسانہ، قصہ اور کہانی جن میں بنیادی اہمیت کہانی کو حاصل ہے اور پلاٹ کے عمل دخل کے ذریعے کہانی کو نقطہ عروج تک پہنچایا جاتا ہے۔ دوسرے وہ افسانے یا کہانی جو مخصوص کرداروں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور انہیں کرداری افسانے بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو "گتے کے پہلوان" کے چند ایک افسانوں کو چھوڑ کر باقی افسانوں میں پلاٹ کی تکنیک کے حوالے سے کوئی خاص تنوع نہیں۔ وہی روایتی انداز ہے کہ جس میں کہانی ابتداء، وسط اور انتہا تک جا پہنچتی ہے۔ مگر عرفان احمد بیگ کی خوبی یہ ہے کہ روایت کی پاسداری کرنے کے باوجود انکے افسانوں میں واقعات کا ربط ایک منطقی نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ انداز انکا خاص علامتی انداز بھی ہے۔ اس قسم کے افسانوں کی مثال "مشرق، گھنٹہ گھر" کہے جا سکتے ہیں۔ جہاں واقعات بے ہنگم نہیں اور تمام واقعات مربوط ہیں اور کہانی ایک ہی رو میں بہہ رہی ہے۔ عرفان بیگ اپنے افسانوں کا اختتام تعجب خیز بناتے ہیں اور قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آیا اس کہانی کا کوئی اور منطقی انجام بھی ہو سکتا ہے؟

عرفان بیگ کے چند ایک افسانوں میں پلاٹ کے حوالے سے تنوع بھی ملتا ہے۔ اگرچہ ان کے زیادہ تر افسانے راوی کے زبانی بیان کیے گئے ہیں۔ اور واقعات کا تسلسل بھی اسی طرح ہے۔ مگر "انعطاف نظر، چوتھا زاویہ، کوکھلا چھپاکی، اور کبڑے مسافر" میں کہانی کو کردار اور انکے درمیان مکالمے اور خود کلامی کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ تمام افسانوں میں روایتی پلاٹ کا طریقہ کار نہیں ملتا اس کے برعکس افسانے کی جدید ہیئتوں کو پیش نظر رکھ کر پلاٹ بُنا گیا ہے۔

افسانہ نگار افسانے میں کہانی کی صورت میں زندگی کی کونسی اکائی کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے افسانے میں

Draft

وحدت تاثر کا ہونا لازمی خیال کیا جاتا ہے۔افسانے کا ایک وحدت پر قائم رہنا اسکی سب سے بڑی خوبی ہے تاکہ قاری افسانہ پڑھتے ہوئے اس سے زندگی کے ایک گوشے کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔"گنتے کے پہلوان" کے افسانوں میں وحدت تاثر کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔عرفان احمد بیگ کے افسانوں میں معاشی جبر، محبت اور جنس کے موضوعات کو خاص دخل حاصل ہے۔اور انہوں نے زندگی کے ان گوشوں کو علامتی رنگ دے کر انھیں آفاقی درجہ دینے کی کوشش کی ہے۔"چوتھا زاویہ، کوکھلا چھپاکی، مشرق، گھنٹہ گھر" وحدت تاثر کی بہترین مثال ہیں۔وحدت تاثر کی وجہ سے ان افسانوں کی اہمیت وافادیت بڑھ گئی ہے۔اور اختتام پر ایسی فضا قائم ہوگئی ہے کہ قاری کسی خاص سمت اور زاویے کے متعلق سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔اور یہی وحدت تاثر کی خوبی بھی ہے کہ وہ قاری پر اپنا اثر چھوڑے۔

کہانی میں دلچسپی اور دلکشی قائم رکھنے کے لیے تجسس کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔قاری افسانہ پڑھنے کے دوران ہی تجسس کا شکار ہوجائے کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے؟ یا اختتام کیسا ہوگا؟ تو یہی دلچسپی فنی نقطہ نظر سے اہم ہے۔"گنتے کے پہلوان" کے افسانوں میں بھی اس نقطہ نظر کو مدنظر رکھا گیا ہے۔"ہول، آخری رسوائی، ذرا سی بات، گھنٹہ گھر، انصاف سے پہلے" جیسے افسانوں میں اسی تجسس وجستجو کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔"آخری رسوائی" کے کردار کے ہاتھوں ہیروئن کی بیگ لگنے سے لے کر منشیات کی تلفی تک قاری تجسس کا شکار ہوتا ہے۔ایسے ہی "گھنٹہ گھر" میں جب نوری اور بلو اپنے بچے کی لاش کو لے کر پہاڑوں کی طرف چلے جاتے ہیں تو قاری کے ساتھ ساتھ افسانے کے کردار بھی تجسس کے شکار ہوجاتے ہیں کہ آخر ان دونوں کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟ مجموعی طور پر "گنتے کے پہلوان" کے افسانے تجسس وجستجو کے تمام اصولوں پر پورا اترتے ہیں اور قاری کی دلچسپی کو بھی برقرار رکھتے ہے۔

"گنتے کے پہلوان" میں شامل چودہ افسانے اپنی تکنیک کے اعتبار سے علامتی اور بیانیہ انداز لیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی علامت نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہے۔

> "علامت نگاری ایک مشکل فن ہے۔شعروادب کی طرح افسانہ نگاری میں بھی علامتی انداز بہت اہمیت کا حامل ہے۔اس کے ذریعے لفظوں کی معنویت میں وسعت پیدا ہوکر وہ اجتماعی زندگی کا استعارہ بن جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔علامت نگاری لفظوں کو ایک نئی معنویت دے کر زندہ کرنے کا ایسا آرٹ ہے جو ہر بڑے ادیب کے اسلوب کا طرہ امتیاز ہوا کرتا ہے۔"(۲۸۔)

Draft

۷۰ء کی دہائی میں بلوچستان میں جاری مخدوش حالات کی وجہ سے یہاں بھی علامتی انداز کے افسانے لکھنے شروع ہوئے۔اور کئی افسانہ نگاروں نے علامتی انداز میں ظلم و ستم اور استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔انہی حالات کو مدنظر رکھ کر ڈاکٹر عرفان بیگ نے بھی اپنی اسلوب کو خالص علامتی جامہ پہنایا۔انکا یہ علامتی انداز خاص انہی کا اپنا رنگ ہے۔عرفان بیگ نے سماج اور معاشی جبر کے المیوں کو علامتی شکل دے کر قاری کے سامنے ایک منطقی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

"گتے کے پہلوان، بندر اور ملیریا، چوتھا زاویہ، کبڑے مسافر، انعطاف نظر" انکے کامیاب علامتی افسانے ہیں۔مذکورہ افسانوں میں علامتی تکنیک اپنی تمام تر صورتوں میں استعمال کی گئی ہے۔ان افسانوں میں عرفان بیگ نے علامتوں کے ذریعے قاری کو زندگی کے مختلف رخ، انداز اور زاویوں سے روشناس کرایا ہے۔

ڈاکٹر فاروق احمد لکھتے ہیں۔

> "عرفان احمد بیگ کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے مطالعے کی وسعت کے باوجود ذہنی طور پر کسی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ان کی اپنی علامتیں ہیں اپنا زاویہ نگاہ ہے اور اپنا ہی انداز اظہار ہے۔"(۲۹۔)

زندگی کے اجتماعی مسائل کو علامتوں کے ذریعے بیان کرنے کا فن عرفان احمد بیگ کو خوب آتا ہے۔"گتے کے پہلوان اور کبڑے مسافر" میں جبر، استحصال، معاشی مسائل ایک شخص کی ذات کی حدوں سے نکل کر اجتماعی طور پر تیسری دنیا کے ہر شخص کی علامت بن جاتی ہے۔زندگی کو جینے کا فن عرفان کو خوب آتا ہے۔کھیلنے کودنے کی عمر سے تلاش رزق کے لیے جتجو کرنے والے اس شخص کی قلم نے علامتی انداز میں "چوتھا زاویہ" جیسا شاہکار تخلیق کر دیا ہے۔جوہر میر "گتے کے پہلوان" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "اس مجموعے کے سبھی افسانوں میں علامت نگاری کا فن غالب نظر آنے کے باوجود افسانے پر مسلط دکھائی نہیں دیتا۔قاری کو افسانے کے خاتمے پر دعوت فکر دیتا ہے۔سوچنے سمجھنے کی ترغیب دیتا ہے اور یقیناً کسی تحریر کا یہ وصف کمال فن سے کم نہیں ہوتا۔"(۳۰۔)

Draft

عرفان احمد بیگ کا اسلوب سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ان کا اسلوب قاری کو الجھنے نہیں دیتا اور نہ ہی کسی ابہام کا شکار ہونے دیتا ہے۔ان کا اسلوب انکی اپنی زندگی سے ماخوذ ہے۔حالانکہ انکے علامتی رنگ کی وجہ سے ایک عام قاری کہانی کو گرفت میں نہیں لا سکتا مگر انکا یہ انداز اسلوب کی خامی نہیں ہے۔وہ جدید افسانے کے علمبردار ہے اور تیسری دنیا کے وہ کہانیاں سنا رہے ہیں جنھیں عام طور پر تحریر نہیں کیا جاتا۔وہ اپنے اسلوب کی رومانی فضا میں ان تلخ حقائق کو پیش کر رہے ہیں جو تیسری دنیا کے انسان کا وطیرہ بن گیا ہے۔وہ ایسے انسان کی کہانی سنا رہے ہے جسے نہ ماضی سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ ہی مستقبل اس کے لیے عذاب ہے۔وہ صرف حال میں جی رہا ہے اور وہ حال بھی اس پر تنگ ہو چکی ہے۔وہ زندگی کے ان تمام زاویوں کو افسانوں کی شکل دے رہے ہیں جو انہوں نے خود ذاتی طور پر محسوس کیے ہیں۔وہ جدید افسانے کے ایسے لکھاری ہے کہ جسے ایک پڑھے لکھے قاری کی تلاش ہے جو کہانی کے ساتھ ساتھ انکی علامتیں۔تکنیک اور دیگر مسائل پر بھی گرفت رکھتا ہو۔بقول ڈاکٹر فاروق احمد:

> ”عرفان احمد بیگ کا علامتی رنگ پڑھے لکھے قاری کے لیے پیغام بن جاتا ہے لیکن عام قاری شاید اسے گرفت میں نہیں لے سکتا۔لیکن وہ علامت میں جو بھی گفتگو کرتے ہیں وہ بجائے خود ایسی ذہنی آسودگی فراہم کرتے ہیں جو شاید ہمارے تحت الشعور کے اطمینان کا باعث ہوتے ہیں۔“(۳۱۔)

مشینوں میں گرے انسان بھی مشین بن گئے ہیں ان کے پاس ادب پڑھنے کے لیے اتنا وقت نہیں اور ادب کی گرہیں کھولنا تو الگ بات ہے۔عرفان احمد بیگ جدید قاری کے انہی رجحانات سے واقف ہے۔اس لیے وہ اپنے سادہ اسلوب کے ذریعے زندگی کے مسائل کو پیش کر رہے ہیں۔تاکہ قاری کو اس میں کوئی ابہام نظر نہ آئے۔ڈاکٹر فاروق احمد لکھتے ہیں:

> ”عرفان احمد بیگ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت ہی سادہ سہل اور رواں انداز میں لکھتے ہیں اور انکے افسانوں میں علامتی اور رومانوی رنگ بھی جلوہ گر ہے۔ اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اپنے گہرے مشاہدے کو کسی ایک مخصوص زاویے سے

Draft

نہیں دیکھتے۔ زندگی نے اِن کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے اور وہ جس طرح زندہ رہنے
کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں وہ ان کے افسانوں میں جا بجا دکھائی دیتا
ہے۔ لیکن یہ انکی ذات کا نوحہ نہیں ہے۔ عرفان احمد بیگ اپنی ذات سے
بہت دور نکل کر زندگی کو دیکھ رہے ہیں۔"(۳۲۔)

ڈاکٹر فردوس انور قاضی "گتے کے پہلوان" کے اسلوب کے بارے میں لکھتی ہے:

"گتے کے پہلوان " کا یہ اسلوب عرفان احمد بیگ کی
تحریروں میں ایک نئی جہت اور نئے انداز کا نقطۂ آغاز ہے۔"(۳۳۔)

ادب کی سرحدیں وسیع ہیں کسی بھی لکھاری کو زمان و مکان کی بندشوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ "ذرا سی بات" کا سیاہ فام انسان، "گنگ" کا گنگا کردار، "گتے کے پہلوان" کا کلرک اپنی ذات کی کہانیاں نہیں بلکہ تمام انسانوں کی کہانیاں لگتی ہیں۔ عرفانؔ احمد بیگ کی یہی ہمہ گیریت اسے اُردو کے صف اوّل کے افسانہ نگاروں میں شامل کر دیتا ہے۔

عرفانؔ احمد بیگ نے اپنے افسانوں میں علامتی اور بیانیہ انداز کے ساتھ ساتھ شعور کی رو تکنیک کو بھی کامیابی سے برتا ہے۔ "کوّلا چھپائی" شعور کی رو تکنیک میں لکھا گیا کامیاب افسانوں میں شامل ہے۔ افسانے میں کردار کی خود کلامی، نفسیاتی کشمکش، زندگی، موت اور خوف کو دکھایا گیا ہے۔

مجموعی طور پر "گتے کے پہلوان" کے تمام افسانے فنی معیار کا بہترین ثبوت ہیں۔ افسانے کے تمام فنی عناصر (پلاٹ، کردار، منظر نگاری، وحدت تاثر، تجسس و جستجو) کو فنی باریک بینی سے استعمال کیا گیا ہے۔ اور عرفانؔ بیگ کا یہ مجموعہ فن افسانہ نگاری میں ایک نیا اضافہ ہے۔

Draft

حوالہ جات:۔

۱) عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر، "گتے کے پہلوان"۔ دیباچہ، فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، ص۔ ۱۱

۲) ایضاً، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مضمون "ایک اہم افسانہ نگار" فاروق احمد، ڈاکٹر، ص۔ ۱۵

۳) ایضاً، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مضمون "علامت نگاری اور عرفان احمد بیگ" جوہر میر، ص۔ ۲۰

۴) فردوس انور قاضی، "اردو ادب کے مختلف زاویے"، مشمولہ "عرفان احمد بیگ فن اور شخصیت"، ص۔ ۳۴۰

۵) عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر، "گتے کے پہلوان"، افسانہ "مشرق"، ص۔ ۳۲

۶) فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، "اردو ادب کے مختلف زاویے"، مشمولہ "عرفان احمد بیگ فن اور شخصیت" ص۔ ۳۴۰

۷) عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر، "گتے کے پہلوان"، افسانہ "بندر اور ملیریا"، ص۔ ۵۲

۸) ایضاً، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ افسانہ "بندر اور ملیریا"، ص ۔ ۵۲

۹) ایضاً، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ افسانہ "گنگ"، ص۔ ۶۲

۱۰) ایضاً، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ افسانہ "گنگ"، ص۔ ۶۲

۱۱) فردوس انور قاضی، ڈاکٹر ، "اردو ادب کے مختلف زاویے" ، مشمولہ، "عرفان احمد بیگ فن اور شخصیت" ص ۳۳۸، ۳۳۹

۱۲) عرفان احمد بیگ ، ڈاکٹر ، "گتے کے پہلوان"، افسانہ "کوکلا چھپاکی"، ص۔ ۸۲

۱۳) فردوس انور قاضی ، "اردو ادب کے مختلف زاویے" ، مشمولہ "عرفان احمد بیگ فن اور شخصیت" ص، ۳۳۷

۱۴) انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، "بلوچستان میں تذکرہ اُردو" ، ص۔ ۱۹۶

۱۵) عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر ، "گتے کے پہلوان" ، افسانہ "انعطاف نظر"، ص۔ ۳۴

۱۶) ایضاً، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ افسانہ "کبڑے مسافر"، ص۔ ۸۶

Draft

۱۷) ایضاً،-------------------------------افسانہ،"ببول"ص۔ ۷۳

۱۸) ایضاً،-------------------------------افسانہ،"ببول"، ص۔ ۷۹

۱۹) ایضاً،-------------------------------افسانہ،"ببول"، ص۔ ۷۹

۲۰) ایضاً،-------------------------------افسانہ، "ببول"، ص۔ ۷۶

۲۱) ایضاً،-------------------------------افسانہ،" گتے کے پہلوان"، ص۔ ۳۸

۲۲) ایضاً،-------------------------------افسانہ،"گھنٹہ گھر"، ص۔ ۴۲

۲۳) ایضاً،-------------------------------افسانہ،"سیڑھی پر رکھی آنکھ"،ص۔ ۱۰۷

۲۴) ایضاً،-------------------------------افسانہ،"چوتھا زاویہ"، ص۔ ۵۷، ۵۸

۲۵) ایضاً،------------------------------- افسانہ،"ببول"، ص۔ ۷۳

۲۶) ایضاً،------------------------------- افسانہ،"ببول"،ص۔ ۷۵

۲۷) ایضاً،-------------------------------افسانہ،"چوتھا زاویہ"، ص۔ ۵۸

۲۸) فردوس انور قاضی، ڈاکٹر،"اردو ادب کے مختلف زاویے"، مشمولہ"عرفان احمد بیگ فن اور شخصیت"،ص۔ ۳۴۲

۲۹) عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر،" گتے کے پہلوان"، مضمون"ایک اہم افسانہ نگار" فاروق احمد، ڈاکٹر، ص۔ ۱۷

۳۰) ایضاً،-------------------------------مضمون"علامت نگاری اور عرفان احمد بیگ"،جوہر میر،ص۔ ۲۱

۳۱) ایضاً،-------------------------------مضمون"ایک اہم افسانہ نگار" فاروق احمد، ڈاکٹر، ص۔ ۱۸

۳۲) ایضاً،-------------------------------مضمون"ایک اہم افسانہ نگار" فاروق احمد، ڈاکٹر، ص۔ ۱۷

۳۳) فردوس انور قاضی،"اردو ادب کے مختلف زاویے"، مشمولہ"عرفان احمد بیگ فن اور شخصیت"۔ ص۔ ۳۴۳

Draft

ماحصل

پاکستان بالخصوص بلوچستان میں اُردو ادب کی آبیاری، ترقی اور ترویج میں ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کا بہت بڑا نام ہے۔ انکے ادبی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انکی ادبی خدمات کم از کم چار دہائیوں پر مشتمل ہے۔ بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان ادب کی آبیاری کرنا ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔ مگر ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے مسلسل محنت اور جانفشانی سے کام کرکے اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔ انکی اب تک شائع ہونے والی کتابیں انکے کل تخلیقات کا نصف حصہ بھی نہیں ہیں۔ اب بھی انکے شاعری اور افسانوں کے مسودات کو مرتب کرکے کئی کتابیں شائع کروائی جا سکتی ہیں۔ گزشتہ ابواب میں انکے شعر گوئی اور فن افسانہ نگاری پر مختصراً تبصرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اب بھی انکے اشعار اور افسانوں کی کئی جہات قاری کے سامنے لائی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ہر ادیب کے ہاں فکر اور فن کے حوالے سے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی رہتی ہے۔

عرفان احمد بیگ نے اصناف نظم اور نثر دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ ایک دلنشین شعری اور نثری روایت کے امین ہیں۔ بلوچستان میں اُردو شاعری کے حوالے سے انکا بہت بڑا نام ہے۔ انکے ہاں اشعار میں فکر کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ کہیں وہ رومانیت کے لہر میں بہہ کر داخلی واردات کو اشعار کا جامہ پہناتے ہیں تو کہیں زمانے کے مسائل پر نظر کرکے ترقی پسند شاعری کی روایت میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ افسانوں کے حوالے سے وہ خالص ترقی پسند نظر آتے ہیں۔ انکے افسانوں کی مجموعی فضا عام اور پسے ہوئے طبقے کے لوگ ہیں۔ عام آدمی کے مسائل اور دکھوں کو انہوں نے افسانوں کی شکل دی ہے۔ شاعری اور افسانہ دونوں کے حوالے سے وہ ایک نئی جہت اور اسلوب کے مالک ہیں۔ یہ اسلوب اسے خاص انفرادیت بخشتی ہے کہ وہ کسی سے مرعوب نہیں اور نہ ہی ان کے اسلوب پر کسی دوسرے ادیب کا عکس نظر آتا ہے۔

بلوچستان جیسے علاقے میں جہاں صحافت ایک کٹھن کام ہو وہاں حق گوئی اور بے باکی سے لکھنے کے لیے حوصلہ چاہیے۔ بلوچستان میں صحافت کے حوالے سے ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کی خدمات بھی قابل قدر ہیں۔ اب تک ان کے ۷۰۰ سے زائد فیچر آرٹیکلز چھپ چکے ہیں۔ ان آرٹیکلز کو بھی مرتب کرکے شائع کروانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ آرٹیکلز پاکستان بالخصوص بلوچستان میں ریسرچ کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔ تحقیق و تنقید کے حوالے سے بھی ڈاکٹر عرفان احمد بیگ نے گرانقدر خدمات

Draft

سرانجام دی ہیں۔انکے تنقیدی مضامین وقتاً فوقتاً ملک کے معروف رسالوں اور جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔اور سوشل ریسرچ کے حوالے سے انکے کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

عرفان احمد بیگ ہفت جہت آدمی ہیں ۔ انکے تمام جہات پر ایک بہت بڑا کتابی سلسلہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔صحافت، تحقیق و تنقید، ڈرامہ نگاری، فیچر رائٹر ایسے کئی جہات ہیں جن پر کام کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔تا کہ ڈاکٹر عرفان احمد بیگ کا فن کھل کر سامنے آسکے اور انکے اُردو ادبی خدمات سے زمانہ واقف ہو جائے۔

عرفان احمد بیگ کا ادبی سفر جاری ہے۔اپنے اس سفر میں ثابت قدمی کے ساتھ خوب سے خوب تر کی جستجو میں وہ نئی منزلوں کی طرف رواں دواں ہیں۔اگر وہ اسی لگن اور تڑپ اور عزم کے ساتھ مصروف عمل رہے تو یقیناً ادبی دنیا میں نئی فتوحات انکی منتظر رہینگی۔

Draft

کتابیات

۱) اشرف کمال، ڈاکٹر، ''تاریخ اصناف نظم ونثر''، کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۷

۲) انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، ''بلوچستان میں تذکرہ اردو'' کوئٹہ، ادارہ تصنیف وتحقیق، ۲۰۰۶

۳) طارق ہاشمی ، ''اُردو غزل - نئی تشکیل'' اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشاعت اوّل، ۲۰۰۸

۴) عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر، ''گتے کے پہلوان''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز ۲۰۰۱ء

۵) عرفان احمد بیگ، ڈاکٹر، ''لمس کی آہٹ''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

۶) فردوس انور قاضی، ''اردو ادب کے مختلف زاویے''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء

۷) فاروق احمد، ڈاکٹر، ''بلوچستان میں اردو شعر وادب''، کوئٹہ، قلات پبلشرز، ۱۹۹۷ء

۸) گوپی چند نارنگ، ''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب''، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۲ء

۹) (مرتبہ) محمد الیاس کبیر، ''جدید اردو شاعری (روایت سے بغاوت تک)''، لاہور، بیکن بکس، ۲۰۱۶ء

۱۰) مزمل حسین، ''اردو میں علم بیان اور علم بدیع کے مباحث: تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۵

Draft